جلد نمبر۱ شمارہ نمبر۱
جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء
مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ
سہ ماہی
المنار

مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کے عہدیداران اور ممبران
حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے ساتھ
شیریٹن ہوٹل، ہیرس برگ، پینسلوینیا، امریکہ
۲ جولائی ۲۰۱۲ء

کرسیوں پر، دائیں سے بائیں: عرفان احمد خان (جرمنی)، ڈاکٹر ظہیر الدین منصور احمد، چوہدری ظہیر احمد باجوہ (نائب امیر)، محمد اقبال خان، سید ساجد احمد، ڈاکٹر ظفر اقبال، وسیم احمد ملک، ڈاکٹر احسان اللہ ظفر (امیر جماعت امریکہ)، سیدنا حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز، ڈاکٹر محمد شریف خان (صدر مجلس)، راجہ ناصر احمد (جنرل سیکرٹری)، پرویز اسلم چوہدری (سیکرٹری مال)، مختار احمد، ڈاکٹر خالد احمد عطاء، سیّد محمد احمد، عبدالحلیم چوہدری

کھڑے، دائیں سے بائیں: اعجاز خان، رضوان اکبر، حبیب الرحمٰن زیروی (پاکستان)، مرزا عمر احمد (پاکستان)، محمد ادریس منیر، فلاح الدین شمس، مرزا احسان احمد، داؤد منیر، حافظ سمیع اللہ چوہدری، مجیب اللہ چوہدری، محمد عظیم قریشی، مسرور ساجد، سید عبدالشکور، محمد سعید، مبارک تنویر، وسیم احمد، مظفر احمد ملک، ڈاکٹر لئیق احمد

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم　　نحمدہ و نُصلّی علیٰ رسولہ الکریم　　و علیٰ عبدہ المسیح الموعود

جلد نمبر۱　شمارہ نمبر۱　جنوری — مارچ ۲۰۱۳ء

مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

عِلم و عَمَل

تعلیم الاسلام کالج میں جس طرح طلباء کی جسمانی اور اخلاقی تربیت اور ترقی کے لئے بہت سی غیر نصابی سرگرمیوں کا انتظام کیا گیا تھا، اسی طرح طلباء میں علمی اور فکری شعور بیدار کرنے اور تحریر کی صلاحیت اجاگر کرنے کے لیے رسالہ المنار بھی شائع کیا جاتا تھا۔ المنار نے طلباء میں علمی اور ادبی ذوق پیدا کرنے اور تعلیم الاسلام کالج کی روایات کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس خیال کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کے قیام کے ساتھ ہی اراکین عاملہ نے فیصلہ کیا کہ کالج اور مجلس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور طلباء قدیم امریکہ کی علمی و ادبی دلچسپی کے لیے المنار یو ایس اے کا اجراء کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم سہ ماہی المنار یو ایس اے کا پہلا شمارہ آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس مجلہ کے معیار کو بلند کرنے میں ہمیں مجلس طلباء قدیم، امریکہ، کالج کے دیگر طلباء اور تمام قارئین کی بھرپور معاونت حاصل رہے گی۔ ہماری رہنمائی کے لئے نہ صرف اسکی خامیوں کی نشاندہی کریں بلکہ اسے بہتر بنانے کے لئے اپنی تجاویز سے بھی ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں۔

اس مجلّہ کے باقاعدگی سے جاری رہنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس کے لئے اپنی پسند کے موضوعات پر تحریریں ہمیں بھجواتے رہیں۔ یہ دعوت تعلیم الاسلام کالج کے تمام طلباء قدیم اور اساتذہ، کہنہ مشق مصنفین یا نئے لکھنے والوں، سب کے لئے ہے۔

ہمیں آپ کی تحریروں اور آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

المنار کے لیے اپنی تحریریں ایڈیٹر کے نام بذریعہ ای میل درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:

EditorAlmanar@gmail.com

ہاتھ سے تحریر شدہ مسودہ صفحہ کے ایک جانب سیاہ روشنائی میں تحریر کریں اور اگر ممکن ہو تو scan کر کے ای میل کر دیں یا درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:

AlManar USA
4323 Ambrose Ct,
Burtonsville, MD 20866

اس شمارہ میں

مضامین

Title photographs, from the "Rocks around Rabwah" collection of Ata Raja, Rabwah, Pakistan

القرآن الکریم

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۱﴾

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادلنے بدلنے میں صاحبِ عقل لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ [3:191]

عَنۡ اَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ یَقُوۡلُ کَلِمَۃُ الۡحِکۡمَۃِ ضَالَّۃُ الۡمُؤۡمِنِ فَحَیۡثُ مَا وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ فرمایا کرتے تھے کہ حکمت اور دانائی کی بات مومن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہوتی ہے اسے چاہیئے کہ جہاں بھی اسے پائے لے لے۔ کیونکہ وہی اس کا بہتر حق دار ہے۔

رحمانیت کا کام

حضرت مسیح موعودؑ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت جس کا ذکر سورۃ فاتحہ میں ہے کہ:

الحمدللہ رب العالمین ، الرحمٰن الرّحیم

الرحمٰن سے مراد ہے وہ خدا جو ایسے لوگوں کو مطلب پر پہنچا دیتا ہے جن کے لئے کوئی سبب نہ ہو۔ وہ شخص جو چاروں طرف سے بالکل نااُمید ہو گیا ہو۔ وہ جو اپنی ذمہ داریوں سے بالکل نکما نکلا ہے۔ وہ جو بالکل یاس میں ہے۔ اس کا کام بنانے والا الرحمٰن ہے۔ وہ جس کی کشتی ٹوٹ گئی ہے اور وسط دریا میں گر اپڑا ہے۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں جو اسے بچاوے اور اس کے ہاتھ پاؤں نہیں کہ وہ دوسرا قدم آگے کو مارے۔ کون ہے جو اسے بچاوے وہ صرف خدا کی رحمانیت کے رحم سے بچ سکتا ہے“

(ذِکرِ حبیب: مُفتی محمد صادقؓ، صفحہ ۸۸ تا ۲۸۷)

لذّتِ نماز

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل فرماتے ہیں:

”ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اسے لذت نہیں ملتی تو اس کو سوچنا چاہئے کہ یہ بھی خدا کا فضل ہے کہ میں نے نماز تو پڑھ لی۔ دوسرا اس سے اعلیٰ ہے۔ وہ نماز سمجھ کر پڑھتا ہے مگر دُنیاوی خیالات نماز میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس کو بھی خوش ہونا چاہئے کہ سمجھ کر تو نماز پڑھنی نصیب ہوئی۔

تیسرا لذت بھی پاتا ہے۔ اس کو بھی خوش ہونا چاہئے۔ اس طرح انسان ترقی کر سکتا ہے۔ شکر کرنے سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ اگر پہلے ہی نماز کو اس خیال سے کہ لذت نہیں ملتی کوئی چھوڑ دے تو وہ کیا ترقی کرے گا۔“

رپورٹ

مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کی سرگرمیاں

راجہ ناصر احمد، سیکرٹری

مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کی مجلس عاملہ کے انتخابات ۳۰ جون ۲۰۱۲ء کو منعقد ہوئے۔ جسکی منظوری حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے عطا فرمائی۔ عہدیداران کے نام درج ذیل ہیں:

صدر: پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان

سیکریٹری: راجہ ناصر احمد

فنانس سیکریٹری: پرویز اسلم چوہدری

ایگزیکٹو ممبر ۱ : ناصر جمیل

ایگزیکٹو ممبر ۲ : ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری

جب حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز جلسہ سالانہ امریکہ کے بعد ہیرس برگ میں مقیم تھے تو آپنے ازراہ شفقت ہماری درخواست کو منظور فرماتے ہوئے طلباء قدیم کے ساتھ ایک گروپ فوٹو میں شرکت فرمائی، جو اس شمارے کی زینت ہے۔

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور خواہش کے مطابق پاکستان میں احمدی طلباء کی امداد کے لئے گزشتہ سال ہمارے ممبران نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے تیرہ ہزار ڈالر جمع کئے اور حضور انور کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت پائی۔ حضور نے مطعیان کے لیے دعا کرتے ہوئے یہ قربانی منظور فرمائی، الحمدللہ۔

انتخاب کے بعد طلباء قدیم کا پہلا اجلاس گزشتہ سال عید الفطر کے بعد ہوا۔ اراکین عید ملن کے لیے ۲۵ اگست کو لال قلعہ ریسٹورنٹ بالٹی مور میں اکٹھے ہوئے اور بے تکلف ماحول میں وقت گزارا۔ بعد ازاں ایک اجلاس ہوا جس میں ورجینیا، واشنگٹن ڈی سی، میری لینڈ اور نیو جرسی سے آئے ہوئے اراکین شامل ہوئے۔

۱۳ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ایسوسی ایشن کا ایک اجلاس مسجد بیت الرحمٰن سلور سپر نگ میری لینڈ میں ہوا جسکی صدارت جناب پروفیسر محمد شریف خان صاحب نے کی۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی محترم جسٹس (ریٹائرڈ) محمد اسلام بھٹی صاحب تھے۔ اپنے عملی تجربات کی روشنی میں جسٹس بھٹی صاحب نے پاکستان کے عدالتی نظام اور اعلیٰ عدالتوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ جسے سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور فاضل مقرر سے اہم سوالات بھی کئے۔ اجلاس میں بیرونی جماعتوں کے متعدد اراکین نے جو ایک جماعتی اجتماع کے لئے پہلے سے تشریف لائے ہوئے تھے، شرکت کی۔ اجلاس کے دوسرے حصے میں ایک مختصر شعری نشست بھی منعقد ہوئی۔ مکرم صادق باجوہ صاحب نے اسکی نظامت کے فرائض سرانجام دئے۔ اس نشست میں ڈاکٹر محمد ظفراللہ خان، اکرم ثاقب، اکرم محمود اور صادق باجوہ نے اپنا اپنا کلام سنایا اور حاضرین سے خوب داد وصول کی۔

ایسوسی ایشن نے ایک ادبی محفل کا انعقاد بھی کیا جس میں حاضرین کو دو زبانوں یعنی اردو اور پنجابی میں دعوت کلام دی گئی۔ یہ محفل ۲۵ دسمبر ۲۰۱۲ء کو سلور سپرنگ میں منعقد ہوئی۔ جس میں جناب ڈاکٹر آغا شاہد صاحب (مہمان مقرر) جناب سفیر رامہ صاحب اور خاکسار راجہ ناصر نے مضامین پڑھے۔ شعراء میں جناب اکرم ثاقب اور جناب حبیب اللہ باجوہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرکے خوب داد پائی۔ ڈاکٹر آغا شاہد نے اپنی اردو اور پنجابی نظمیں سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔

جناب پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی صاحب ایک نجی دورے پر امریکہ تشریف لائے تو ہماری درخواست پر طلباء قدیم کے ساتھ کچھ وقت گزارنا منظور فرمایا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو سلور سپرنگ میری لینڈ میں مرحوم ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے اجلاس ہوا جس میں محترم پروازی صاحب نے شاہ جی کی شخصیت پر ایک تفصیلی مضمون پڑھا جو اب المنار جرمنی شاہ جی نمبر میں چھپ چکا ہے۔ حاضرین نے اپنے محسن استاد کا ذکر کرتے ہوئے ذاتی واقعات سنائے اور شاہ جی کے لئے دعائے خیر کی۔

جیسا کہ اکثر احباب کو علم ہوگا مجلس نے جناب سفیر رامہ صاحب کے تعاون سے ایک ویب سائٹ بھی قائم کر رکھی ہے، جسکا اڈریس ticalumniusa.org ہے۔ تمام ممبران سے درخواست ہے کہ سائٹ پر جا کر ہماری مختلف قسم کی مساعی کا جائزہ لیں اور اسکو مزید بہتر بنانے کے لئے تجاویز دیں۔ اس سائٹ پر المنار کے پرانے شمارے بھی رکھ دیئے گئے ہیں جو یقیناً آپکی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہء پارینہ را

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی

دوسری کُل پاکستان اُردو کانفرنس

ڈاکٹر پرویز پروازی

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمدؒ

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں پہلی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ایم اے (آکسن) اس وقت کالج کے پرنسپل تھے اور یہ کانفرنس انہی کے ایما اور ارشاد پر ہوئی تھی کیونکہ اُس وقت پاکستان میں اردو کو بہت سے مسائل درپیش تھے اور تعلیم یافتہ طبقہ اردو زبان کے خلاف مختلف محاذوں پر سرگرم تھا مگر جماعت احمدیہ اردو زبان سے کس طرح غفلت برت سکتی تھی کہ یہ ہماری قومی زبان ہی نہیں مذہبی زبان بھی تھی، اور ہے۔ اس ماحول میں پرنسپل صاحب نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ایک کُل پاکستان اردو کانفرنس کا اہتمام کرو، کالج اس کے لئے مناسب ماحول اور اخراجات مہیا کرے گا۔ اس کانفرنس کی تفصیلی روئداد تاریخ احمدیت جلد نہم کے صفحات ۱۳۱ سے ۱۳۶ پر موجود ہے۔

نومبر ۱۹۶۵ء میں حضرت مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث کے مرتبہء عظیم پر فائز ہوگئے۔ جماعت کی سربراہی و رہنمائی کے مقصد عظیم کے علاوہ اپنی قومی زبان اردو کا خیال ان کے دل سے محو نہیں ہوا تھا۔ حضرت صاحب نے ۱۹۶۶ء کے وسط میں مجھے یاد فرمایا اور برسبیل تذکرہ پوچھا دوسری اردو کانفرنس کب کر رہے ہو؟ میں حضور کو کیا جواب دیتا؟ مجھے اندازہ تھا کہ کانفرنسوں کے اہتمام و انصرام پر کتنا کام کرنا پڑتا ہے اور کتنا خرچ اٹھتا ہے۔ میں نے عرض کیا حضور جب ارشاد فرمائیں گے میں اس کام میں جُت جاؤں گا۔ فرمایا پھر دیر کس بات کی؟ ہاں، کانفرنس یک روزہ نہ ہو کم از کم دو روزہ ہو۔ میں نے آمنا و صدقنا کہا۔ رخصت چاہی۔ دروازہ تک پہنچا تو حضور نے فرمایا اخراجات کی فکر نہ کرنا مگر یہ بات صرف تمہارے کانوں کے لئے ہے۔

یہ دو روزہ کانفرنس اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۱۴ اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو تعلیم الاسلام کالج کے عظیم الشان ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا افتتاح جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے فرمایا۔ قبلہ قاضی محمد اسلم صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج نے خطبہء استقبالیہ ارشاد فرمایا اور خاکسار ناصر احمد پروازی نے وہ پیغامات پڑھ کر سنائے جو اس موقعہ کے لئے مؤقر اور نامور ارباب کمال و ادب نے ارسال فرمائے تھے۔ سب سے پہلا پیغام تو حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثالث امام جماعت احمدیہ کا تھا۔ اس پیغام میں حضور نے جماعت احمدیہ کی اردو زبان و ادب کے ساتھ وابستگی کا ذکر فرمایا تھا اور حاضرین جلسہ کو اپنی زبان کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔ حضور کے پیغام کے علاوہ جناب اختر حسین سابق گورنر مغربی پاکستان اور صدر انجمن ترقیء اردو پاکستان کا تھا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی　　قاضی محمد اسلم

دوسرا پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا تھا۔ صدر ایوب کی جانب سے پیغام بھیجنے کا وعدہ کیا گیا تھا مگر عین وقت پر ان کا پیغام موصول نہ ہؤا۔ اس کی وجہ بہت بعد کو مجھے قدرت اللہ شہاب صاحب کے ذریعہ معلوم ہوئی جبکہ میں اسلام آباد کے ادبی حلقہ دائرہ کی ایک تقریب میں شامل تھا۔ قدرت اللہ شہاب کو اس مجلس میں مضمون پڑھنا تھا۔ مضمون کے بعد گفتگو ہوئی تو میرا تعارف ہؤا۔ کہنے لگے ”اچھا تو آپ ہیں ربوہ میں اردو کانفرنسیں کروانے والے۔“ میں نے کہا جی میں تو صرف ایک کارکن تھا، میرے ساتھ اور حضرات بھی شامل تھے۔ شہاب صاحب کہنے لگے آپ کی ذرا

سی بے احتیاطی صدر کے پیغام میں رکاوٹ بن گئی، آپ کو کس حکیم نے نسخہ میں لکھ کر دیا تھا کہ آپ ہمارے استفسار کے جواب میں یہ لکھیں کہ پہلا پیغام تو امام جماعت احمدیہ کا ہوگا۔ میں نے عرض کیا جناب جب پہلا پیغام تھا ہی ان کا تو میں کیسے یہ بات آپ سے مخفی رکھتا۔ پھر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جماعت احمدیہ اردو سے صرف قومی زبان ہی کی حیثیت سے ہی نہیں اپنی مذہبی اور دینی زبان کی حیثیت سے بھی محبت کرتی ہے۔ ہماری کانفرنس میں صدر مملکت کا پیغام نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کانفرنس میں پاکستان کی سب یونیورسٹیوں کے مندوبین شریک ہوئے، معیاری مقالہ جات پڑھے گئے، پریس میں اس کا چرچا رہا۔ دو سو سے زیادہ مندوبین کا ربوہ جیسی جگہ میں اکٹھا ہو جانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔ جب یہ بات ہو رہی تھی اس وقت بھی پانچ ایسے افراد وہاں موجود تھے جو بحیثیت مندوب اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔
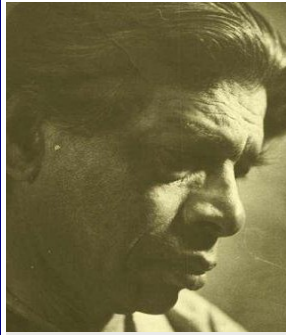
اس کانفرنس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ملک کے متعدد یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں نے اپنے اساتذہ میں سے نمایاں ادبی ذوق رکھنے والے افراد کو اپنا خصوصی مندوب بنا کر بھیجا تھا۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے علاوہ کراچی یونیورسٹی کی جانب سے میجر آفتاب حسن صاحب پرنسپل اردو کالج اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی کے مندوب کے طور پر شریک ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مندوبین میں جناب ڈاکٹر سید نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، ڈاکٹر محمد عبد العظیم صدر شعبہ کیمیا پنجاب یونیورسٹی اور جناب سید عابد علی عابد شامل تھے۔ سندھ یونیورسٹی کے مندوب

ڈاکٹر سیّد نذیر احمد

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ

محسن احسان

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب تھے۔ پشاور یونیورسٹی کے مندوب مشہور شاعر جناب محسن احسان تھے۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے مندوبین میں خود وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی اور جناب پروفیسر ممتاز حسین شامل تھے۔ پنجاب کے متعدد کالجوں نے اپنے مندوبین بھیجے تھے جن میں گورنمنٹ کالج لاہور، اسلامیہ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج سرگودھا، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، اسلامیہ کالج فیصل آباد اور گورنمنٹ کالج جھنگ کے ڈیڑھ سو سے زیادہ اساتذہ بطور مندوب شریک ہوئے۔ کانفرنس کے دنوں میں ربوہ میں ایک جشن کا سماں تھا۔ سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا، جناب عصمت علیگ، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور رشید قیصرانی تو گویا ربوہ اور سرگودھا کے درمیان شٹل بنے ہوئے تھے۔ ایک اجلاس میں شرکت کے لئے آتے تو پھر دوسرے اجلاس میں شرکت کے لئے آنے والے نئے مہمانوں کو لے کر آتے۔ ایک اجلاس میں ہمارے کمشنر صاحب شریک ہوئے۔ میں نے انہیں عام مہمانوں کے درمیان بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان کے پاس گیا اور معذرت چاہی کہ ہمیں ان کی تشریف آوری کا علم نہیں تھا۔ فرمانے لگے بس یہی سمجھو کہ اب بھی آپ کو علم نہیں۔ آپ کی جانب سے دعوت نامہ آیا تھا، میں نے مصروفیات کی وجہ سے معذرت کر دی تھی مگر اب کانفرنس کا چرچا سنا ہے تو بن بلائے آگیا ہوں۔ کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بتا دوں کہ مشاعرہ سننے کو دوبارہ آؤں گا مگر کسی کو پتہ نہ چلے۔ آپ آئے تو ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں مگر اپنے نام اور آمد کے اعلان کی ضرورت نہیں سمجھی۔

یہ بات بیان کر دینے کی ہے کہ پاکستان ریلوے نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو کرائے میں خصوصی رعایت دینے کا اعلان کیا تھا۔ اردو کانفرنس کے منتظمین کی جانب سے جاری کردہ دعوت نامہ دکھا دینے پر نصف

ڈاکٹر وزیر آغا

غلام جیلانی اصغر

سیّد عابد علی عابد

کرایہ پر ٹکٹ جاری کر دی جاتی تھی اور اس کے لئے ریلوے نے باقاعدہ احکامات جاری کئے تھے جن کا وسیع پیمانے پر اخبارات میں چرچا کیا گیا۔ اس رعایت سے زیادہ فائدہ تو کراچی، پشاور، ملتان اور راولپنڈی سے شرکت کے لئے آنے والوں نے اٹھایا۔

یہ خصوصیت بھی ہماری کانفرنس کو حاصل ہوئی کہ دفاعی ضروریات کے لئے اردو کے استعمال کے موضوع پر پہلی بار اظہار خیال کیا گیا۔ اس موضوع پر ایئر کموڈور ظفر احمد چوہدری سٹیشن کمانڈر پی اے ایف سرگودھا کا مضمون جناب سکواڈرن لیڈر امداد باقر رضوی نے پڑھ کر سنایا۔ امداد باقر رضوی استاذی المحترم سجاد باقر رضوی کے بھائی تھے۔ جب مضمون پڑھنے کو سٹیج پر آئے تو اکثر احباب کو گمان گذرا کہ قبلہ سجاد باقر رضوی سٹیج پر آ گئے ہیں۔

پہلے روز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ہمارے دوست علامہ یعقوب امجد مرحوم نے اردو میں مستعمل عربی فارسی الفاظ کے تلفظ کا مسئلہ کے عنوان پر اپنا فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ جو الفاظ عربی سے آئے ہیں ان کا عربی تلفظ قائم رہنا چاہئیے ورنہ ان کے معانی بدل جاتے ہیں۔ مقالہ بڑا پر مغز تھا اور سامعین نے بڑی دلجمعی سے سنا۔ ادھر علامہ صاحب نے مقالہ ختم کیا اُدھر قبلہ سید عابد علی عابد نے صاحب صدر سے اجازت چاہی اور سٹیج پر آ گئے اور عالمانہ طریق پر علامہ صاحب کے مفروضہ کا تجزیہ کیا اور اپنی یادداشت کے بل پر اردو کے اساتذہ کے بیسیوں اشعار کا حوالہ دے کر ثابت کیا کہ اردو والوں کے لئے اب وہی تلفظ مستند ہوگا جس کو اساتذہء اردو نے برتا اور استعمال کیا ہے۔ قبلہ سید عابد علی عابد کی اس فاضلانہ فی البدیہہ تقریر نے گویا کانفرنس کی علمی حیثیت کو چار چاند لگا دئے اور سامعین عش عش کر اٹھے۔ ہم نے بہت لوگوں کے مقالے سنے ہیں مگر عابد صاحب کی یہ تقریر اس موضوع پر حرف آخر ٹھہری۔ اس تقریر کا چرچا مدتوں ملک کے علمی ادبی حلقوں میں ہوتا رہا۔

ہمارے مشاعرے تو ہمیشہ ہی معیاری ہوتے تھے مگر اردو کانفرنس والا مشاعرہ اس لئے بھی یادگار ہو گیا کہ سید عابد علی عابد پہلی بار شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے سے قبل سیدنا حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثالث نے کانفرنس کے شرکاء کو کھانے پر مدعو فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی تھی۔ دعوت کا اہتمام صدر انجمن احمدیہ کے دفتر کے شمالی جانب والے لان پر کیا گیا تھا۔ حضور شامیانہ کے دروازے پر ایستادہ تھے اور تمام مہمانوں کا خود استقبال فرما رہے تھے۔ مجھے یاد ہے ڈاکٹر سید نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور حضور سے والہانہ لپٹ کر ملے اور کافی دیر تک حضور کی گردن میں اپنے بازو حمائل کئے رکھے۔ یہ دو پرانے رفقاء کی محبت کا نظارہ تھا۔

ایک اور بات بھی بتا دینے کی ہے کہ اس وقت ربوہ میں گیسٹ ہاؤس نہیں بنے تھے۔ لے دے کر کالج کا ایک گیسٹ ہاؤس تھا اس میں اتنے مہمانوں کی سمائی کہاں ہوتی؟ چنانچہ دار الصدر غربی میں جناب چوہدری شاہنواز صاحب کی کوٹھی میں بعض مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا جن میں سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید نذیر احمد تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے سب لوگ قبلہ قاضی صاحب کی پرنسپل لاج میں تھے۔ فضل عمر ہاسٹل کا ایک حصہ خالی کروایا گیا تھا جس میں بہت سے مہمان ٹھہرائے گئے۔ سرگودھا اور فیصل آباد کے اکثر مہمان تو اجلاسوں کے بعد واپس چلے جاتے تھے مگر جن لوگوں نے قیام کرنا چاہا، ان کا خاطر خواہ انتظام دار الضیافت میں ہو گیا۔ کھانے کے لئے ایسا نفیس انتظام ہمارے ٹک شاپ والے خواجہ شریف صاحب نے کیا کہ باید و شاید۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ مینو بھی عام مینو نہیں تھا۔ پروفیسر نصیر خاں صاحب جیسے صاحب ذوق کا تجویز کردہ اچھا خاصہ پر تکلف کھانا کھلایا جاتا تھا اور بروقت۔ چائے تو ہمہ وقت موجود رہتی۔ جس کا جب جی چاہتا فزکس کی سینئر لیبارٹری میں جا پہنچتا اور گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہوتا۔ سارے رفقاء اس کانفرنس میں حد سے زیادہ تعاون کر رہے تھے۔ سینئر جونئیر سب ہی مندوبین کے آگے بچھے جاتے۔ کالج کے سارے طلباء ہی بطور رضا کار کام کر رہے تھے اور تو اور چنیوٹ کے طلباء نے خود یہ پیش کش کی تھی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والوں کا چنیوٹ سے ہی استقبال کریں گے اور انہیں عزت و احترام سے کالج تک لے کر آئیں گے۔ کئی شرکاء نے حیرت کا اظہار کیا کہ کالج کی وردی پہنے ہوئے طلباء نے چنیوٹ میں ان کا استقبال کیا اور ان کی ہر ممکن مدد کی۔ اسلامیہ کالج چنیوٹ کا سارا اسٹاف اور متعدد طلباء کانفرنس میں شریک ہونے کو آتے رہے۔

الحمد للہ کہ کسی قسم کی بد مزگی پیدا نہیں ہوئی اور کانفرنس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی اس کی یاد اب تک دلوں کو گرماتی ہے۔ امریکہ میں مجلس تعلیم الاسلام کالج والوں کی خواہش پر اس کانفرنس کی یادوں کو صفحہء قرطاس پر منتقل کر رہا ہوں۔ اے کاش الفضل میں چھپی ہوئی تفصیلی رودادیں میرے سامنے موجود ہوتیں تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ ایک حسرت اور بھی ہے کہ پہلی اردو کانفرنس کی طرح اس کانفرنس کی روداد بھی چھپ جاتی تو تعلیم الاسلام کالج کی اہم خدمات میں شمار ہوتی۔

(نوٹ: تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اُردو کانفرنس کے بارے میں درج ذیل اعلانات روزنامہ الفضل ربوہ کی ۱۴ اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئے۔ بشکریہ الفضل ربوہ)

تعلیم الاسلام کالج کی دوسری کل پاکستان اُردو کانفرنس

۱۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء کا پروگرام

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس ۱۴ اکتوبر بروز ہفتہ صبح دس بجے شروع ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ العزیز جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی خطبہ افتتاح ارشاد فرمائیں گے۔ اس کانفرنس میں ملک بھر کے چنیدہ دانشور جن میں یونیورسٹی پروفیسر اور مشہور ادباء و شعراء شامل ہیں شرکت کر رہے ہیں۔ کانفرنس دو روز جاری رہے گی۔ کانفرنس کا پہلے دن (۱۴ اکتوبر) کا پروگرام درج ذیل ہے۔

افتتاحی اجلاس

(بوقت دس بجے تا پونے گیارہ بجے قبل دوپہر)

تلاوت کلام پاک

خطبہ استقبالیہ: پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے (کنٹیب) صدر مجلس استقبالیہ

خطبہ افتتاح:- جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

پیغامات: ناصر احمد پروازی معتمد مجلس استقبالیہ

دوسرا اجلاس (زبان کے مسائل)

(ساڑھے گیارہ بجے تا پون بجے دوپہر)

(صدر جناب ڈاکٹر شوکت سبز واری۔ مدیر اعلیٰ ترقی اردو بورڈ کراچی)

مقررین-:

سید قدرت نقوی- ملتان

ائیر کموڈور ظفر چوہدری۔ پاکستان فضائیہ

یعقوب امجد- کھاریاں

ڈاکٹر سہیل بخاری۔ پاکستان ائیر فورس کالج سرگودھا

ڈاکٹر سید عبداللہ۔ رئیس دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

تیسرا اجلاس (دینی لٹریچر)

(ایک بجے تا ۲ بجے بعد دوپہر)

صدارت ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان صاحب، صدر شعبہ اردوو مندوب سندھ یونیورسٹی حیدر آباد

مقررین:-

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

طفیل احمد قریشی۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ راولپنڈی

ڈاکٹر سید ناظر حسین زیدی شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی

پروفیسر محمد سرور، مدیر فکر و نظر۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ۔ راولپنڈی

وقفہ برائے نماز و کھانا

چوتھا اجلاس

(سائنسی تدریس کے مسائل اور انکا حل- مذاکرہ)

وقت 3 بجے سہ پہر تا ساڑھے پانچ بجے شام

صدارت: جناب ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی

وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائل پور

مقررین-:

ڈاکٹر نصیر احمد خان تعلیم الاسلام کالج ربوہ

ڈاکٹر سید نذیر احمد مندوب پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد عبدالعظیم مندوب پنجاب یونیورسٹی

میجر آفتاب حسن، مندوب کراچی یونیورسٹی

(وقفہ برائے نماز و کھانا)

پانجواں اجلاس ساڑھے سات بجے شب

مشاعرہ

(صدارت: سید عابد علی عابد)

جناب سید عابد علی عابد، جناب شیر افضل جعفری، جناب سید ضمیر جعفری، جناب شرقی بن شائق، جناب نذیر احمد شیخ، جناب عارف عبدالمتین، جناب ثاقب زیروی، جناب غلام جیلانی اصغر، جناب کلیم عثمانی، جناب شور علیگ، جناب عاطر ہاشمی، جناب مقبول قریشی، جناب لطیف انور، اور مقامی شعراء

ناصر احمد پروازی

معتمد مجلس استقبالیہ

----

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء کا پروگرام

ربوہ ۱۴ اکتوبر۔ تعلیم الاسلام کالج کی دوسری کل پاکستان اُردو کانفرنس آج صبح دس بجے سے شروع ہو رہی ہے۔ آج پانچ اجلاس منعقد ہوں گے جن کا پروگرام کل کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۵ اکتوبر کا پروگرام درج ذیل ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء

پہلا اجلاس (ادب کے مسائل)

صدارت: سید وقار عظیم صدر شعبہ اُردو، مندوب پنجاب یونیورسٹی لاہور

۷:۰۰ تلاوت کلام پاک

۷:۰۵ تراجم کی اہمیت و ضرورت --- محمد خان سیال

۷:۱۵ اردو میں بچوں کا ادب --- ڈاکٹر اسد اریب

۷:۲۵ اردو کی کہانی کا دوسرا حصہ --- لطیف انور

۷:۳۵ اردو کا جنگی ادب --- عاطر ہاشمی

مذاکرہ

۷:۴۵ جدید اُردو غزل --- جمیل ملک

۷:۵۵ جدید اُردو نظم ---- اعجاز فاروقی

۸:۰۵ آزاد نظم کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے کا مسئلہ --- عارف عبدالمتین

۸:۱۵ اردو نظم- ماضی، حال اور مستقبل --- جیلانی کامران

۸:۲۵ اردو نظم کا ایک جائزہ --- غلام جیلانی اصغر

۸:۳۵ اردو غزل اور نظم کا بنیادی فرق --- ڈاکٹر وزیر آغا

۸:۴۵ خطبہ صدارت

۹:۰۰ اختتام

دوسرا اجلاس (ادب کے مسائل)

صدارت: ڈاکٹر سید عبداللہ رئیس دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

۹:۱۵ تلاوت کلام پاک

۹:۲۰ اردو ادب پر نفسیات کا اثر --- غلام حسین اظہر

۹:۳۰ تخلیق شعر کا نفسیاتی پس منظر --- عبدالسلام اختر

۹:۴۰ رومانیت کا مفہوم --- سمیع اللہ قریشی

۹:۵۰ ادیب کا منصب --- سید علی عباس جلال پوری

۱۰:۰۰ ابلاغ اور اظہار کا مسئلہ --- سید سجاد باقر رضوی

۱۰:۱۰ جدید نظم کی علامات کا مسئلہ --- غالب احمد

۱۰:۲۰ ادب اور غیر ادبی اقدار--- صدیق کلیم

۱۰:۳۵ خطبہء صدارت

تیسرا اجلاس (صحافت کے فرائض)

صدارت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صدر شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی لاہور

۱۱:۱۵ تلاوت کلام پاک

۱۱:۲۰ مضافات کے روزناموں کے مسائل --- عبدالرشید اشک

۱۱:۳۰ حکومتی رسائل کے مسائل --- عبدالرشید تبسم

۱۱:۴۰ ہفت روزہ رسائل کے مسائل--- ثاقب زیروی

۱۱:۵۰ اردو صحافت کی مشکلات خطبہء صدارت

چوتھا اجلاس (محسنین اردو)

صدارت: ڈاکٹر وزیر آغا۔ مدیر اوراق

۱۲:۴۵ مرزا سلطان احمد --- نسیم سیفی

۱۲:۵۵ مولانا صلاح الدین احمد --- آغا محمد باقر نبیرہ آزاد

۱:۰۵ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد- مسعود احمد خان دہلوی

۱:۱۵ نیاز فتح پوری --- ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۱:۲۵ مولوی عبدالحق--- ڈاکٹر شوکت سبز واری

۱:۳۵ خطبہء صدارت

۱:۴۵ اختتام

(اس لائحہ عمل میں حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے)

پارٹیشن کے زمانے کی چند یادداشتیں

جماعتِ احمدیہ کے ہوائی جہازوں کی مختصر کہانی

محترم سیّد محمد احمد صاحب

قسط اوّل

تقسیم ہند کے وقت جب پنجاب میں فسادات کی ابتدا ہوئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی دور بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ عنقریب قادیان کے زمینی راستے غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر افوج کا فالتو سامان نیلام ہو رہا تھا۔ اس میں سے آپ نے ایک طیارہ خریدنے کا حکم فرمایا۔ اس جہاز کے پائلٹ مکرم سیّد محمد احمد صاحب ابن حضرت میر محمد اسماعیلؓ تھے۔ آپ انڈین رائل ائیر فورس میں پائلٹ تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران آپ نے مختلف محاذوں پر خدمات انجام دیں تھیں۔ جب آپ کو جماعت کا جہاز اُڑانے کا حکم ملا تو آپ فوراً قادیان پہنچ گئے۔ جماعت نے بعد میں دو جہاز اور خریدے جو پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد تک جماعت کے زیرِ استعمال رہے۔ سیّد محمد احمد صاحب نے اِن جہازوں کے بارے میں ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون الفضل میں تین قسطوں میں شائع کیا ہے۔ ذیل میں المنار اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے ان اقساط کے کچھ اقتباسات سیّد محمد احمد صاحب کے الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں خاکسار کی ایک خصوصی پروگرام کے ماتحت سول ایوی ایشن میں ٹرانسفر ہو گئی اور میں انڈین نیشنل ائیرویز (دہلی) میں فلائنگ ڈیوٹی ادا کرتا رہا۔ ان دنوں پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں خاکسار اپنے والد صاحب (حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب) کی وفات پر دہلی سے قادیان بذریعہ ریل پہنچا۔ ان دنوں اطلاعات کا نظام اور امن کے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ وفات کی اطلاع مجھے بہت دیر سے ملی اور دہلی سے قادیان کا ریل کا سفر اتنی دیر میں طے ہوا کہ میں اپنے والد صاحب کی تدفین کے دو دن بعد قادیان پہنچا اور چند دن رہ کر دہلی اپنی ملازمت پر واپس چلا گیا۔

جب میں قادیان میں تھا تو پتہ چلا کہ جماعت نے حضور کی ہدایت پر ایک چھوٹا سادو سیٹر (Two Seater) جہاز از قسم L-5 خریدا ہے اور چند دن پہلے اس جہاز کو ڈپٹی محمد لطیف صاحب قادیان لائے تھے اور انہوں نے اس ہوائی جہاز کو محلہ دارالانوار کی مین سڑک کے اس حصہ پر لینڈ کیا تھا جو کوٹھی النصرت سے مشرقی جانب واقعہ ہے چونکہ محلہ دارالانوار کی مین سڑک پر کوٹھی النصرت تک بجلی کے کھمبے موجود تھے جن کے اوپر بجلی کی تاریں نصب تھیں اس لئے اس سڑک کی مشرقی Extension کا صرف ڈھائی سو گز لمبا کچا حصہ ہی اس قابل تھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا اور ہلکا جہاز اتر سکے۔ اس قلیل المدت ٹرپ کے بعد ڈپٹی محمد لطیف صاحب ہوائی جہاز کو لاہور (والٹن ائیرپورٹ) پر سول ایوی ایشن کی انتظامیہ کی سپردگی اور نگرانی میں چھوڑ کر اپنی ملازمت پر بمبئی واپس چلے گئے تھے۔

L-5 قسم کے چھوٹے جہاز امریکن افواج جنگ عظیم دوم کے آخری چند سالوں میں برائے فضائی سروے اور جنگی فرنٹ پر سے زخمی فوجیوں کو فوری طور پر پیچھے فیلڈ میڈیکل سنٹرز میں پہنچانے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ یہ ایک سخت جان جہاز تھا جسے بہت چھوٹی جگہ پر لینڈ کیا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے اسے ہوائی جیپ (Air Jeep) کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

ڈپٹی محمد لطیف صاحب مرحوم لاہور کے ایک مخلص احمدی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد محترم ڈپٹی محمد شریف صاحب سول سروس میں ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کہلاتے تھے۔ اس لئے آپ کے تینوں بیٹوں کے اصلی ناموں سے پہلے اضافی لفظ ڈپٹی استعمال ہوتا تھا۔ آپ اپنے والد صاحب مرحوم کے دوسرے بیٹے تھے۔ آپ نے جنگ عظیم کے شروع میں ائیر فورس جائن کی۔ 1943ء میں جب وہ رائل انڈین ائیر فورس ایک فائٹر سکواڈرن کی کمانڈ کر رہے تھے کہ برما فرنٹ پر ان کے ہوائی جہاز کو جاپانیوں نے مار گرایا۔ وہ برما میں کریش لینڈنگ کرتے ہوئے بچ تو گئے مگر جاپانیوں نے انہیں جنگی قیدی بنا لیا۔ وہاں کئی برس کی صعوبتیں جھیل کر جنگ کے اختتام پر واپس آئے تو انہیں ایک بے حد مشکل اور تکلیف دہ ابتلا میں سے گزرنا پڑا۔ اور جس کی وجہ سے انہوں نے بہت تکلیف اٹھائی۔ وجہ یہ تھی کہ برما اور سنگاپور کے فرنٹ پر جتنے بھی ہندوستانی فوجی جاپانیوں نے جنگی قیدی بنائے تھے ان میں بہت سے قیدیوں نے ”انڈین نیشنل آرمی“ میں شمولیت کر لی تھی۔ جس کی قیادت ایک سابقہ کانگریسی لیڈر سبھاش چندر بوس (عرف نیتاجی) کر رہے تھے۔

ڈپٹی محمد لطیف صاحب اگرچہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ جنگ کے اختتام پر وہ جاپانیوں کی فوجی جیل سے رہا ہوئے تھے اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں لگنا چاہئے تھا۔ مگر ایک ہندو قیدی کی مکاری اور غلط بیانی کی وجہ سے انہیں بھی نوکری سے نکال دیا گیا۔ پارٹیشن سے کچھ عرصہ پہلے تک آپ بمبئی کی ایک کمپنی میں بطور پائلٹ کام کر رہے تھے جس نے انڈیا میں جنگ عظیم کے اختتام پر امریکی فالتو جنگی سامان کے ڈپوز میں سے چند L-5 قسم کے ہوائی جہاز خریدے تھے اور پھر انہیں پانچ ہزار روپے فی جہاز کے حساب سے ضرورتمند پارٹیوں کو فروخت کیا تھا۔ انہی کی کوشش سے جماعت نے پہلا L-5 جہاز خریدا جو پارٹیشن کے وقت جماعت کے کام آیا (جماعت نے بھی اس کی قیمت پانچ ہزار روپے ادا کی تھی)

ابھی جولائی ۱۹۴۷ء کے آخر میں مجھے قادیان سے دہلی واپس آئے ہوئے چند دن گزرے تھے۔ شاید جولائی کا آخری ہفتہ تھا یا اگست کا شروع۔ یہ یاد ہے کہ رمضان کا مہینہ تھا کیونکہ میں روزے سے تھا کہ رات کے وقت ایک صاحب قادیان سے دہلی تشریف لائے اور انہوں نے رات کو مجھے جگوایا (میں ان دنوں صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب مرحوم کے بالی گنج دہلی والے گھر میں رہتا تھا۔) اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کا ایک ضروری خط مجھے دیا جس میں لکھا تھا کہ آپ فوراً لاہور جائیں اور جماعت کا L-5 ہوائی جہاز (جو سول ایوی ایشن انتظامیہ والٹن ایئرپورٹ کی تحویل میں تھا) اسے لے کر فوراً قادیان پہنچیں۔ اس خط کے ساتھ منسلک ایک اتھارٹی لیٹر بھی والٹن ایئرپورٹ کے مینیجر کے نام تھا کہ وہ جماعت کا ہوائی جہاز مجھے Deliver کر دیں۔

خاکسار نے صبح اٹھتے ہی لاہور جانے کا پروگرام بنایا۔ اپنی ایئرلائن جن کی میں ملازمت کرتا تھا کو بھی اطلاع نہ دی۔ دوپہر کو انڈین نیشنل ایئرلائن کی فلائٹ لی۔ والٹن ایئرپورٹ لاہور سے ایئرلائن کی کوچ میں (جس کے پاس کرفیو کے اوقات میں بھی گاڑی چلانے کا اجازت نامہ تھا) فلیٹیز ہوٹل Flatties Hotel پہنچا۔ رات اسی ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے دن صبح اسی ایئرلائن کی کوچ میں والٹن ایئرپورٹ پہنچا، اور جماعت کے ہوائی جہاز کی ڈیلیوری لی مگر دیکھا کہ ہوائی جہاز کے تینوں ٹائر قریباً فلیٹ ہیں اور ہوائی جہاز منوں مٹی اور گرد سے اٹا پڑا ہے۔ اور اس کی بیٹریاں بھی مکمل طور پر ڈسچارج ہو چکی ہیں۔ ان دنوں امن کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے کوئی مددگار بھی مہیا نہیں ہو سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے آدھا دن لگا کر اس جہاز کو اڑنے کے قابل بنا لیا۔ صفائی کی اس کارروائی سے ہوائی جہاز تو خاصا صاف ستھرا ہو گیا مگر میں بھوت بن گیا۔ سہ پہر تک میں نے جہاز کو پرواز کرنے کے قابل تیار کر لیا۔ ایک نقشہ بھی مہیا ہو گیا۔ گو میں نے اس قسم کا ہوائی جہاز کبھی نہیں اڑایا تھا مگر میں نے اپنی عقل سمجھ سے جہاز کو سٹارٹ کر کے ایک ٹیسٹ فلائٹ بھی کر لی۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر اس جہاز میں قادیان کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور پونے گھنٹے میں قادیان پہنچ گیا۔

قادیان پہنچ کر یہ طے پایا کہ جہاز کے انچارج صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ہوں گے جو اس وقت صدر مجلس خدام الاحمدیہ تھے اور ساتھ ساتھ حفاظت مرکز کے بھی انچارج تھے۔ ان کی اجازت سے پہلے چند دن تو قادیان کے گردونواح کے فضائی سروے کے مشن سرانجام دیئے۔ نقشہ پر قادیان کے اردگرد کے وہ گاؤں مارک کئے جو سکھوں کی اکثریت والے تھے۔ اور وہ بھی جو مسلمانوں کی اکثریت والے تھے۔ نیز وہ کون کون سے مسلمان اقلیت والے گاؤں تھے جن پر سکھوں کے حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس دوران بعض سکھ اکثریت والے گاؤں کی طرف سے مسلم اقلیت والے گاؤں پر حملے بھی شروع ہو چکے تھے۔

چونکہ خدام الاحمدیہ کی ایک سروے ٹیم بھی زمینی راستوں سے اپنی جیپ نما گاڑی میں قادیان کے اردگرد اسی قسم کے سروے کرتی رہتی تھی تو میں اس گاڑی کو اپنے سروے کے دوران آسانی سے ڈھونڈ لیتا تھا۔ اور اگر انہیں میری ضرورت پڑتی (جس کے لئے وہ اپنی گاڑی میں سے ایک جھنڈی بلند کرتے) تو میں قریبی کھیت میں لینڈ کر جاتا تھا۔ ان سے رابطہ کرتا اور ان کی زبانی رپورٹ کو فوری طور پر قادیان پہنچا دیتا۔ بعض دفعہ تو ایسی ایسی تنگ اور چھوٹی جگہ یا راستوں پر میں نے لینڈ کیا کہ وہاں سے دوبارہ اڑنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ اتنا مشکل کہ کئی بار درختوں سے ٹکراتے بال بال بچا۔

ایک دن اطلاع ملی کی بٹالہ کے قریب ”علی وال“ کے علاقے میں سکھ گھڑ سواروں نے پانچ مسلمان گاؤں پر حملہ کر دیا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کے قتل وغارت کی کارروائی ہو رہی ہے۔ میں فوری طور پر ہوائی جہاز میں وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ مسلمانوں کے پانچوں گاؤں سکھوں کے حملوں کی زد میں ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ گھروں کے صحنوں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ میرے پاس صرف ایک طریقہ تھا کہ بہت ہی نیچی پرواز کر کے سکھ گھڑ سواروں کو Buzz کروں۔ Buzz کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بے حد نیچی پرواز کر کے زمین پر کھڑے یا بھاگتے انسان یا سوار کو ڈرانا کیونکہ وہ سمجھتا

ہے کہ اب جہاز مجھ سے ٹکرا جائے گا۔ چنانچہ میں نے کئی بار ایسا کیا۔ جس سے پیدل حملہ آور تو ادھر ادھر چھپ گئے مگر بعض سکھ گھڑ سوار مختلف اطراف میں بھاگے۔ ایک بھاگتے ہوئے سکھ گھڑ سوار کو جب میں نے بے حد نیچی پرواز کر کے Buzz کیا تو اس کے گھوڑے نے ڈر کے مارے اپنے سوار کو اچھال کر ایسے زور سے زمین پر پٹخا کہ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بے حد لطف آیا!

ان دنوں کا ایک خاص اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک صبح قادیان سے لاہور جانے کے ٹائم سے کچھ پہلے حضور نے مجھے قصر خلافت کے دفتر میں بلوایا اور فرمایا کہ آج تم نے میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز لاہور لے جانی ہے اور اس چیز کی راستے میں پوری حفاظت کرنی ہے اور اس چیز کو تم نے شیخ بشیر احمد صاحب (جو اس وقت لاہور کے امیر جماعت تھے) کو ان کے گھر سے والٹن ایئرپورٹ پر بلوا کر ان کے سپرد کرنی ہے اور انہیں اس چیز کی خاص حفاظت اور احتیاط کے بارے میں تم نے شیخ صاحب کو انہیں الفاظ میں بتانا ہے، جیسے میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ پھر تم نے ان سے اس کی وصولی کی رسید لینی ہے۔ جو واپس تم نے مجھے دینی ہے۔ میرے ناپختہ ذہن میں اس وقت یہ احمقانہ خیال آیا کہ شاید حضور مجھے کوئی ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا بکس دیں گے۔ یہ کہہ کر حضور اٹھے اور ساتھ والے کمرے میں سے ایک میلا سا چھوٹا سا ٹریول بیگ (Travel Bag) لائے۔ یہ بیگ کاغذات سے بھرا ہوا تھا۔ آپ نے وہ بیگ میرے سامنے رکھا اور فرمایا میری قرآن شریف کی لکھی ہوئی تفسیر کا کچھ حصہ تو چھپ چکا ہے۔ کچھ حصہ لکھا جا چکا ہے مگر ابھی چھپا نہیں۔ مگر ابھی بہت سے حصے کی تفسیر لکھنے کا کام باقی ہے۔ چونکہ میری زندگی کا ایک بڑا مشن اس تفسیر کو مکمل کرنے کا ہے۔ اس لئے میری عادت ہے کہ دن ہو یا رات چلتا پھرتا ہوں اور یا کوئی اور کام کر رہا ہوں۔ مگر جو بھی کر رہا ہوں اگر قرآن شریف کی کسی آیت کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی نیا مطلب آئے تو میں فوراً اس پوائنٹ کو ایک سادہ کاغذ پر لکھ کر اس بیگ میں ڈال کر محفوظ کر لیتا ہوں تا کہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔ ضروری نہیں کہ ان کاغذات پر لکھے ہوئے نوٹس میں کوئی ترتیب ہو مگر میرے لئے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے۔ میں نے حضور سے بیگ لیا۔ اسے سنبھالا اور اسے ہوائی جہاز میں رکھ کر لاہور لے گیا۔ ساتھ جانے والے جماعتی کارکن کو والٹن ایئرپورٹ پر اتارا کہ وہ جماعت کے کاموں کے لئے شہر چلا جائے۔ پھر میں نے ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور جا کر شیخ بشیر احمد صاحب کو فون کیا اور انہیں فوری طور پر والٹن ایئرپورٹ پہنچنے کے لئے کہا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے حضور کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک بے حد ضروری چیز آپ کے سپرد کرنی ہے اور یہ چیز میں کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتا۔ قسمت اچھی تھی کہ اس وقت کرفیو نہیں تھا۔ اس لئے شیخ صاحب پونے گھنٹے میں والٹن ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ (یاد رہے کہ اس زمانے میں لاہور کی نہر کے پل سے آگے فیروز پور روڈ پر والٹن ایئرپورٹ کے گیٹ تک خاص آبادی نہیں تھی۔ اس لئے والٹن ایئرپورٹ کے ہوائی جہازوں کے کھڑے ہونے والے حصے سے فیروز پور روڈ اور اس پر چلتا ہوا ٹریفک صاف نظر آتا تھا) میں نے اپنے ہوائی جہاز کے قریب سے ہی جب شیخ صاحب کی کار نے فیروز پور روڈ سے والٹن ایئرپورٹ کے مین گیٹ کی جانب ٹرن لیا دیکھ لیا۔ جب وہ ہوائی جہاز کے قریب پہنچے تو میں نے حضور والا بیگ ہوائی جہاز میں سے اتارا اور اسے ہوائی جہاز کے پیچھے کی جانب ٹارمیک Tarmac پر رکھ دیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے بیگ کی طرف اشارہ کر کے انہیں حضور کے بیان کردہ الفاظ سنائے اور بیگ ان کے سپرد کر دیا اور ان سے دستخط کروا کر رسید لے لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ بیگ کے پاس ہی ٹھہریں تا کہ میں کنٹرول ٹاور جا کر ایک ضروری کام کر آؤں۔ وہ وہاں میری واپسی تک ٹھہرے رہے اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جسے وہ لے کر آئے تھے میرا انتظار کرتے رہے۔ جب میں واپس آیا تو کل ساتھ آنے والا جماعتی کارکن بھی ایئرپورٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اب میں نے شیخ صاحب سے اجازت مانگی۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ بیگ انہوں نے حفاظت سے اپنی کار میں رکھ لیا ہو گا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے قادیان واپس جانے کی تیاری کی اور جماعتی کارکن کو مع سامان کے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور حسب قاعدہ جہاز کے پیچھے دیکھنے والے آئینہ Rear View Mirror پر نظر ماری تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور والا بیگ جہاز سے چند قدم پر زمین پر پڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شیخ صاحب ابھی راستے میں ہی ہوں گے، اور ابھی گھر نہیں پہنچے ہوں گے۔ اس پریشانی کی حالت میں ہوائی جہاز سے اترا۔ میرا اندازہ تھا کہ گھر پہنچ کر انہیں پتہ چلے گا کہ وہ بیگ ایئرپورٹ پر ہی بھول آئے ہیں اور پھر واپس آنے تک اتنی دیر ہو جائے گی کہ ہم قادیان اس لئے روانہ نہیں ہو پائیں گے کہ رات پڑ جائے گی اور قادیان میں رات کو لینڈنگ کرنے کی مدد گار Flares روشنیاں بھی نہیں ہیں۔ ابھی اس سخت پریشانی کی حالت میں میں کھڑا فیروز پور روڈ کی جانب دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک کار نے فیروز پور روڈ سے والٹن ایئرپورٹ کے مین گیٹ کی طرف اس تیزی سے بائیں جانب ٹرن لیا جس سے کار کے ایک جانب کے دونوں پہیے زمین سے اٹھ

گئے اور ساتھ ہی ایک تیز سیٹی نما دھماکہ کی آواز آئی۔ شکر ہے کار اُلٹی نہیں بلکہ بے حد تیزی سے ہماری جانب آئی۔ اس وقت میں نے پہچانا کہ شیخ صاحب کی کار ہے۔ الحمدللہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا۔ شیخ صاحب جلدی سے کار میں سے نکلے۔ انہوں نے سخت ندامت کا اظہار کیا مگر وہ اس بات پر شکر گذار تھے کہ میں ابھی تک وہاں موجود تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ ہوائی جہاز واپس قادیان چلا گیا ہو گا اور بیگ کہیں غائب نہ ہو گیا ہو۔ یا گم نہ گیا ہو۔ جب قریب آئے تو انہیں ٹارمیک پر پڑا ہوا بیگ نظر آیا۔ اسے دیکھنے کے بعد ہی شیخ صاحب کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے بیگ اٹھایا۔ اور مجھے دوبارہ الوداع کہہ کر اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ہم قادیان کے لئے روانہ ہوئے۔ قادیان پہنچ کر میں سیدھا حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے پاس گیا اور انہیں سارا قصہ سنایا۔ انہوں نے ساری بات سن کر مجھے تاکیداً یہ ہدایت دی کہ تم نے ہر گز ہر گز حضور کو یہ بات نہیں بتانی کہ آپ کا بیگ شیخ صاحب ایئر پورٹ پر بھول گئے تھے۔ نہ آج اور نہ آئندہ کبھی۔

اس لئے حضور سے ملاقات کے دوران میں نے شیخ صاحب کی دستخط کردہ رسید تو حضور کو دے دی مگر اس واقعہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ نہ اس وقت اور نہ بعد کو کبھی۔

ایک ہندو نوجوان جو لاہور میں اپنی فلائنگ کی ٹریننگ مکمل کر چکا تھا اور بطور پائلٹ کسی انڈین ایئر لائن میں ملازمت کا خواہش مند تھا اس ہندو نوجوان کے پاس ہماری طرح کا L-5 ہوائی جہاز تھا۔ چونکہ اس کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اس لئے وہ اپنا ہوائی جہاز ہمارے پاس فروخت کرنے کا خواہش مند تھا۔ اگرچہ اس کے ہوائی جہاز کا انجن ہمارے جہاز کے انجن سے معمولی سا کمزور تھا کیونکہ اس کا ہوائی جہاز ہمارے جہاز سے 300 گھنٹے زیادہ اڑان کر چکا تھا۔ مگر وہ اپنے ہوائی جہاز کی قیمت 5000 روپے ہی مانگ رہا تھا اور اس میں کمی کرنے پر راضی نہ تھا۔ بالآخر میں نے حضور سے اجازت لے کر اس کی قیمت کو منظور کر کے اس سے سودا کر لیا۔ اس نے اپنا L-5 تو ہمارے سپرد کر دیا مگر اس کی رجسٹریشن کے کاغذات اپنے پاس ہی رکھے اور کہا کہ جب تم رقم دو گے تو میں کاغذات دوں گا۔ مگر اچانک لاہور میں اتنی بدامنی شروع ہو گئی اور وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ (رقم دینے سے پہلے) اچانک انڈیا چلا گیا۔ اس لئے ہم اسے اس جہاز کی قیمت ادا نہ کر سکے۔ بعد کو جب میں نے سول ایوی ایشن محکمہ پاکستان کو یہ ساری بات بتائی تو انہوں نے جہاز کے نئے رجسٹریشن کاغذات ہمارے نام بنا دیے۔ اس طرح مالی لحاظ سے یہ دوسرا L-5 جماعت کو مفت کا پڑا۔ اب ہمارے پاس دو L-5 جہاز ہو گئے۔

تیسری بات یہ ہوئی کہ انہی دنوں ڈپٹی محمد لطیف صاحب بمبئی سے اپنی ملازمت چھوڑ کر لاہور پہنچے اور میرے ساتھ دوسرا L-5 جہاز اڑا کر قادیان آ گئے۔ اب پوزیشن یہ ہو گئی کہ ایک L-5 جہاز وہ اڑاتے اور دوسرا میں۔

(الفضل، ربوہ۔ ۲۶-۲۷-۳۰ اگست ۲۰۱۰ء)

(جاری ہے)

ابو القاسم الزہراوی

(۹۳۶ء-۱۰۱۳ء)

زکریا ورک کینیڈا

ابو القاسم خلف بن عباس الزہراوی، اسلامی سپین کا ممتاز طبیب، سرجن، کیمیا دان، کاسموٹالوجسٹ اور سائنسدان تھا جو عالم اسلام کا بڑا سرجن اور ماڈرن سرجری کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی شاہکار تصنیف کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں ان تمام آلات جراحی کی تصاویر دی گئیں تھیں جو الزہراوی نے اپنی سرجری کی پریکٹس میں استعمال کئے تھے۔

الزہراوی کی پیدائش قرطبہ سے چھ میل دور مدینۃ الزہراء میں ہوئی، جہاں آپ کا خاندان عرب سے آکر آباد ہوا تھا۔ الزہراوی کی زندگی کا زیادہ وقت قرطبہ میں گزرا۔ جہاں تدریس کے ساتھ سرجری کا کام کیا ۔ ۔ خلیفہ الحکم الثانی ۹۱۴ء تا ۹۷۶ء کے طبیب رہے۔ قرطبہ میں اس وقت ایک سڑک کا نام الزہراوی سٹریٹ Calle Albucasis ہے۔

الزہراوی کی شاہکار تصنیف التصریف لمن عجز عن التالیف (The Method of Medicine) دراصل طب کا انسائیکلوپیڈیا ہے یورپ میں لاطینی ترجمہ کے بعد بہت مقبول عام ہوئی۔ کتاب میں الزہراوی نے جو نئی نئی میڈیکل ٹکنیکس اور طریقے دیئے ہیں وہ واقعی انسان کو انگشت بدنداں کر دیتے ہیں۔

الزہراوی کی ہدایات کے مطابق طبیب کو مریض کا علاج کرتے وقت قریب سے مشاہدہ کرنا چاہئے۔ آپ نے نیم حکیموں کی زوردار الفاظ میں مذمت کی جو علاج کے بدلے دولت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

کتاب میں جو کیس ہسٹریز دی گئیں ہیں ان سے بیماریوں کی شناخت ہو جاتی ہے۔ قریب قریب ہر اس مرض کا ذکر ہے جو عہد وسطیٰ میں پائی جاتی تھیں۔

الزہراوی نے جانوروں پر سرجری کر کے ان کے اندرونی نظام کا انسانوں کے اندرونی نظام سے موازنہ کیا۔ ارسطو اور جالینوس کے مقابلہ میں الزہراوی کا علم انسانی جسم کے بارہ میں دقیق و عمیق تھا۔

الزہراوی نے میڈیسن کی ہر فیلڈ میں اظہار خیال کیا۔ حمل اور تولید کی فیلڈ Obstetrics میں آپ نے جو باتیں بیان کیں وہ پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

الزہراوی نے جوڑوں کے موضوع یعنی Orthopedics پر کئی مقالات لکھے۔ ایک تکنیک جو آپ نے وضع کی اس کو اب Kocher's technique کہا جاتا ہے۔ اس تکنیک میں کندھے کی ہڈی کو ٹھیک کیا جاتا ہے۔ یورپ میں یہ تکنیک انیسویں صدی تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔

بچوں کی تعلیم کے بارہ میں الزہراوی نے والدین کو نصیحت کی کہ ان کی تعلیم میں دل چسپی لیں، اچھی تربیت کریں اور بچوں کے فطری رجحان کا خیال رکھیں۔

الزہراوی نے طب کی تاریخ میں پہلی بار خون کے ایک مرض کا ذکر کیا جو ماں سے بیٹوں کو وراثت میں منتقل ہوتا ہے، یعنی ہیموفیلیا۔

الزہراوی کو دانتوں کی حفاظت اور سرجری میں بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے دانتوں کے گوناگوں مسائل کے حل پیش کئے، اور مصنوعی دانت ہڈی اور لکڑی سے بنا کر لگائے۔

الزہراوی نے پلاسٹک سرجری شروع کی۔ التصریف میں پلاسٹک سرجری اور reconstructive surgery کے کئی طریقے بیان کئے گئے ہیں جو اب بھی پلاسٹک سرجن استعمال کرتے ہیں۔

مریض کے پیشاب کے معائنے سے مسلمان اطباء بیماری کی شناخت کر لیتے تھے۔ آپ نے مثانہ، گردوں، سنگ مثانہ کے علاج کے لئے نئی تکنیک ایجاد کیں۔

الزہراوی نے انتڑیوں کا آپریشن کیا۔ زخموں کو سینے کیلئے ریشم اور بھیڑوں کی انتڑیوں سے بنے دھاگے کو استعمال کیا۔ انسانی جسم کے نظام اعصاب پر بھی

الزھراوی نے تحقیق کر کے نئے نئے انکشافات کئے۔

ناک کی ہڈی جوڑنے کیلئے الزھراوی نے طریقے بتائے۔ کان کے نازک ترین آپریشن کئے، اور کانوں کے اندر مشاہدہ کرنے اور آپریشن کرنے کیلئے آلات سرجری بنائے۔ ہوا کی نالی کے آپریشن tracheotomy کا تفصیل سے ذکر کیا۔

ماہر امراض چشم کی حیثیت سے آنکھوں کے علاج میں الزھراوی نے موتیابند کے آپریشن کئے۔

عورتوں کے امراض اور ان کے علاج میں الزھراوی نے خاص دل چسپی لی اور انکی اکثر ہدایات آج بھی کار آمد ہیں۔

جس وجہ سے الزھراوی کو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا وہ یہ کہ آپریشن کے دوران مریض پر روشنی منعکس کرنے کیلئے آپ نے آئینہ استعمال کیا۔ یہ تکنیک عورتوں کی بچہ دانی کے تنگ حصہ cervix کا معاینہ کرتے وقت استعمال کی۔

آپریشن روم کے لیئے الزھراوی سبز رنگ کا گاؤن پہنتے تھے جو اب بھی دنیا میں سب سرجن زیب تن کرتے ہیں۔

شریانوں سے بہتے خون کو بند کرنے کیلئے آپ نے کاٹرائیزیشن کی تکنیک کو پہلے سے بہتر بنایا۔ زیادہ خون کو روکنے کیلئے آپ نے بڑی بڑی شریانوں کو آپس میں گانٹھ مار دینے کی تکنیک ligation ایجاد کی۔ جو یورپ میں A. Pare نے چھ سو سال بعد دریافت کی تھی۔

الزھراوی نے ۲۰۰ کے قریب آلات سرجری ایجاد کئے، جیسے:

tongue depressor, tooth extractor, obstetric devices, forceps to extract dead fetus, hook to remove nasal polyps, device to perform enema, surgical knives and saws. scalpels, curettes, retractors, spoons, hooks, rods, specula, surgical needle.

کتاب التصریف Do's and Don'ts کا ایک ٹیکنیکل مینوئل ہی نہیں بلکہ اس میں طب کی پریکٹس کیلئے جامع اور مفید ہدایات دی گئیں تھیں۔

اسلامی دنیامیں یہ پہلی کتاب ہے جس میں سرجری کو میڈیسن سے الگ شاخ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ طالب علم جو سرجن بننے کے خواہش مند تھے الزھراوی نے ان کو زریں ہدایات سے نوازا۔ آپ نے تقاضا کیا کہ طالب علم طب کے گر سیکھنے کیلئے لمبا عرصہ صرف کریں، میڈیسن کی تعلیم مکمل کریں، قبل اس کے کہ وہ خود کو کسی ایک فیلڈ میں سپیشلائز کریں۔

کتابیات

S.K. Hamarneh, Health sciences in early Islam: Collected Papers, Dec. 1984

قضیّہ سلام کرنے نہ کرنے کا

محمد ظفراللہ

اپنی تو یہ عادت ہے کہ کوئی سوال دماغ میں کلبلایا اور پڑ گئے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر۔ یہ عادت ہماری کوئی آج کی نہیں۔ جب چھوٹے تھے تو ابا اور اماں کے کان کھایا کرتے تھے۔ اسکول کا کچھ اچھی طرح یاد نہیں کہ کس کس کے کان کھائے، کچھ تو اس لیے کہ ہم نے بہت کم اسکولوں میں چند ماہ سے زیادہ وقت گزارا، بس کلاس پاس کی اور بھاگے۔ اور کچھ اس لئے کہ اسکولوں میں اساتذہ کو اکثر کان کھینچنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

ہاں کالج میں ہم کو چونکہ کالج سے زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا اور اساتذہ بھی بہت سے ایسے ملے کہ وقتی طور پر ہی سہی اماں باوا کو بھی بھلا دیا۔ اس لیے سوال پوچھنا اور سوال وجواب کرنا بھی کچھ انہی لوگوں سے زیادہ یاد ہے۔ آج کی نشست کے لیے ہم نے ایسے ہی ایک سوال کا انتخاب کیا ہے۔ پر قبل اس کے کہ ہم اپنی رام کہانی شروع کریں ذرا " کالج میں ہم کو چونکہ کالج سے زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا" کی وضاحت ہو جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم فضل عمر ہاسٹل میں رہتے تھے جو کہ کالج سے، جیسا کہ اکثر قارئین جانتے ہیں، متصل تھا (بلکہ کالج ہی میں تھا)۔ تو گویا جب کالج نہیں ہوتا تھا، یعنی بند ہوتا تھا، ہم تب بھی کالج میں ہی ہوتے تھے۔ اور ہاں ہم اکثر گرمیوں کی چھٹیاں بھی ہاسٹل اور کالج ہی میں گزارتے پائے جاتے تھے۔

سلام والا مسئلہ کچھ یوں شروع ہوا کہ ہم نے کہیں کسی اخبار میں یہ پڑھ لیا کہ کوئٹہ میں ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کو سلام کا جواب نہ دینے پر پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ کالجوں کے خلاف تو بہت کچھ کہا گیا ہے، مثلاً اکبر الہٰ آبادی کیا خوب فرما گئے ہیں:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

پر دکھ کی بات ہے کہ بہت کم لوگوں کو کالج کے حق میں کچھ لکھنے کی توفیق ایسے رنگ میں ہوئی کہ حضرت اکبر، وفات کے بعد ہی سہی، لاجواب ہو جاتے۔ تو صاحبو سنو جو گوش ہوش نیوش ہو، کالج سوچنا سکھاتا ہے۔

ہاں جی کالج سوچنا سکھاتا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی افتادِ طبع کی بات ہے کہ کوئی سیدھا سوچنا شروع کر دے یا ہماری طرح ہر بات کو ذرا سا مشکل بلکہ ٹیڑھا لے کر اس پر اپنا دماغ اور وقت صرف بلکہ ضائع کرنا شروع کر دے۔ ہماری اس افتادِ طبع کے ذمہ دار صرف ہم ہی نہیں تھے بلکہ ہماری بعض تحریروں وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بعض اساتذہ کا یہ خیال تھا کہ ہم کوئی فلسفی وغیرہ بنیں گے بڑے ہو کر۔ بلکہ ہمارے ایک کرم فرما استاد نے تولے کے ہماری ایک تصویر بھی چھاپ دی اس عنوان کے ساتھ: محمد ظفراللہ ہمارے ابھرتے ہوئے فلسفی اور ریاضی دان۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پر خیر ریاضی دان تو بن گئے، بڑے نہ سہی چھوٹے ہی سہی۔ رہا فلسفہ تو آپس کی بات ہے نہ تب پڑھا اور نہ بعد کو، پر ہمیں ترس تو اپنی پانچویں یا چھٹی کی ان استانی صاحبہ پر آتا ہے، جنھوں نے ہماری ایک ڈرائنگ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ ظفراللہ اگر تم زندہ رہے تو ایک بہت بڑے آرٹسٹ بنو گے۔ بے چارے اساتذہ، ہر ٹیڑھے میڑھے پتھر کو ہاتھ میں لیکر اسکوہیر ابنانے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی سلام والے مسئلے کی۔ ہم نے یہ سوچا کہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر سلام چونکہ بڑے اور صاحب وجاہت لوگوں کو کیا جاتا ہے، اور چونکہ سلام کا جواب دینا گویا سلام کرنے والے کی حیثیت کو تسلیم کرنا ہوا۔ ہو نہ ہو یہ سلام کا جواب نہ ملنے پر پتھر مارنے کا عمل ہماری معاشرت کے تناظر میں ایک فطری امر تھا۔ اگلا مرحلہ ٹھہرا ایک دھانسو سا سوال مرتب کرنے کا۔ سو یوں ٹھہری کہ ہم وہ خبر سنا کر یہ پوچھیں گے کہ، سلام کا جواب نہ ملنے پر پتھر مارنے کے عمل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟

یہ تو کچھ یاد نہیں کہ کتنے حضرات ہمارے اس سوال کا شکار ہوئے، پر یہ یاد ہے کہ اکثریت کا جواب تقریباً یہ تھا " یہ حرکت انتہائی احمقانہ ہے۔ اگر مجھے کوئی میرے سلام کا جواب نہ دے تو میں تو اسے پتھر نہیں ماروں گا" اکثر بزرگوں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ "تم بھی پتھر نہ مارنا" جہاں کہیں ہمت پڑی ہم نے عرض کیا کہ صاحب

آپ تو ماشاءاللہ اتنے پڑھے لکھے ہیں آپ تو ایسی حرکت نہیں کریں گے، پر ایک ان پڑھ دیہاتی کے پاس اتنی عقل ہوتی تو یہ خبر ہی نہ بنتی۔ پر آخر میں نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلتا تھا کہ سلام کا جواب نہ ملنے پر پتھر نہ مارنا، بری بات ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ، گو کہ ہم ایسی باتوں کو توہمات میں گنتے ہیں، اس روز ہم نے سنجیدگی سے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔
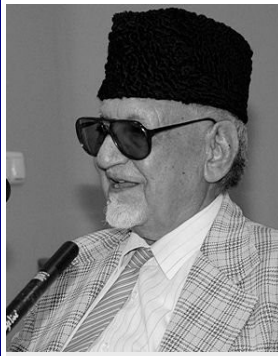
خیر تو جب ہم کالج سے فارغ ہوئے تو ہاسٹل کی سوجھی۔ سوچا کہ چلو چوہدری صاحب سے پوچھتے ہیں۔ "چوہدری صاحب" سے ہماری مراد پروفیسر چوہدری محمد علی ہی تھے۔ اس زمانے میں چوہدری صاحب ہمارے ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چوہدری صاحب کا نام ذہن میں آیا، تو ساتھ ہی دل صاحب نے الارم بجا دیا۔ خیر جب ہر پہلو سے اپنا خطاکار ماضیٔ قریب ٹٹول لیا اور یقین ہو گیا کہ کوئی ایسی قابل تعزیر بات نہیں جس کا علم چوہدری صاحب کو ہونے کا امکان ہو تو اپنی ہمت خود ہی بندھاتے ہوئے چوہدری صاحب کی کوٹھی کی جانب چلے۔

پروفیسر چوہدری محمد علی

کواڑ کھٹکھٹانے پر جب چوہدری صاحب برآمد ہوئے تو ہم نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے جو فرمایا وہ تو اچھی طرح یاد نہیں پر تقریباً تقریباً یہ فرمایا: مادی اشیا کے متعلق یہ پیشگوئی کرنا کہ بعض خاص حالات میں انکا عمل یا ردّ عمل کیا ہو گا آسان ہے، جبکہ انسانوں کے، انہی حالات میں، ردّ عمل کی پیشگوئی کرنا بہت مشکل ہے۔ فرض کرو کہ دو سائیکل سوار آمنے سامنے سے آتے ہوئے ٹکرا کر گر جاتے ہیں۔ تم سائیکلوں کے متعلق تو کہہ سکتے ہو کہ وہ جہاں گرے تھے وہیں پڑے رہیں گے لیکن سائیکل سواروں کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اٹھ کر ایک دوسرے سے معذرت کریں گے یا لڑنا شروع کر دیں گے۔

حق تو یہ تھا کہ ہم اس قدر جامع اور مسکت جواب سن کر خوشی سے ناچنا شروع کر دیتے پر ادب مانع ہوا۔ تھوڑا سا افسوس یہ ہوا کہ ہم نے چوہدری صاحب سے پہلے ہی یہ سوال کیوں نہ پوچھ لیا۔ خیر اب پچھتائے کیا ہوت والا معاملہ تھا، اور ہم اپنی غلطیوں پر اتنا پچھتانے والے ہوتے، دوسرے الفاظ میں اتنے شرم والے ہوتے، تو اب تک کب کے اس جہان سے پردہ کر گئے ہوتے۔ شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں اس مثال پر سر دھنتے ہوئے اپنے کمرے کو سدھارے۔

چوہدری صاحب کی دی ہوئی مثال یہاں امریکا آنے کے بعد کئی بار کام آئی۔ ہمارا کچھ عرصے سے یہ معمول ہے کہ جب دماغ کام کرنا بند کر دے تو ہم انٹرنیٹ کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ اپنے جیسے کوڑھ مغز چھوٹے لوگوں کی سنتے ہیں اور کچھ اپنی سناتے ہیں، بہانہ تو ریاضی پر بات کرنے کا ہوتا ہے، پر ہر پھٹے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض منصبی جانتے ہیں۔ ایک آدھ بار ایک صاحب نے ایمپیریکل سائیکالوجی سے متعلق اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا تو ہم نے یہ مثال جڑ دی۔ یوں بھی ہم اکثر بعض معاملات میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر اس مثال کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی مشق کر لیتے ہیں۔ اس مثال کو یاد کرنا ہمارے لئے ایک طرح کے علاج کی صورت ہے کہ چلو ہم تو کچھ نہ بن سکے پر ہم نے استاد تو ایسے ایسے نابغہ ہائے روزگار پائے تھے۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ بس ایک مثال ہے ان جواہرپاروں کی جو کہ ہم نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیے۔ اب یہ ہماری کوڑھ مغزی ہی سمجھیں کہ ہم ان سب باتوں کو پلے باندھ کر نہ رکھ سکے۔ ہمارے سبھی اساتذہ ایسے تھے کہ ہر ایک اپنی مثال آپ۔ اب ذرا چوہدری صاحب ہی کو لیں- سائیکالوجی میں ایم اے کر رکھا تھا، پر کہیں انگریزی ادب پڑھا رہے ہیں اور کہیں فلسفہ کے ادق مضامین کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ اردو اور پنجابی کے شاعر بھی اعلیٰ پائے کے تھے، اور ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ انگریزی اہل زبان کی طرح لکھتے تھے۔ آپ نے سلسلے کی بہت سی کتب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔

وہ بات تو رہی جاتی ہے جس کے حوالے سے ہم نے یہ قصّہ سنانا شروع کیا تھا۔ موصوف ہمارے ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے اور گو کہ بہت ہمدرد بلکہ دستگیر آدمی تھے، ڈسپلن کو قائم رکھنے کی خاطر سخت گیری کا مظاہرہ بھی کر لیتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے چوہدری صاحب ایک واقف زندگی تھے اور، دوسرے اساتذہ کی طرح، وقف کی روح کو سمجھتے تھے۔ سو ہر ایک کام جو انکو دیا جاتا تھا اسکو کماحقہٗ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی روح کارفرما تھی کہ جب کشتی رانی کی ٹیم چوہدری صاحب کے سپرد کی گئی تو چوہدری صاحب نے کشتی رانی کی ٹیم کو بلندی پر پہنچا دیا، جب انکے ذمے باسکٹ بال کی ٹیم ہوئی تو چوہدری صاحب اکثر باسکٹ بال کی ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرتے دیکھے جاتے تھے۔ سلسلے کی ایسی بے لوث خدمت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسا فہم بھی اپنی خاص جناب سے عطا کرتا ہے کہ ہم ایسے کٹ حجتوں، کج بحثوں اور سوال پر سوال کرنے والوں کو مسکت جواب دے سکیں اور انکی رہنمائی بھی کر سکیں۔

یکے از کرم ہائے کرم فرما

امتیاز احمد چوہدری

نیوجرسی. یو ایس اے

غالب سے معذرت کے ساتھ

"واں کے ہیں اور واں سے ہی آئے ہوئے تو ہیں"
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

خاکسار اللہ تعالیٰ کے حضور نہایت ہی شکر گزار اور ممنون ہے کہ اس عاجز کو تعلیم الاسلام کالج (جبکہ یہ لاہور میں تھا) سے ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء مستفید ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ عرصۂ مختصر میرے موجودہ دائرہ عمل بطور طبیب و جراح کی عمارت کی پہلی اینٹ بنا۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود یہ کیسے اور کیونکر ہو پایا۔ یہ داستان بہت سادہ اور دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ احباب بھی کچھ نہ کچھ مزہ لیں گے۔

دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوا۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ میں نے اپنے گاؤں کے قریبی ہائی سکول قلعہ سوبھا سنگھ ضلع سیالکوٹ سے ۱۹۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا (رول نمبر ۳۱۰۲۹)۔ ہائی فرسٹ ڈویژن حاصل ہوئی مگر ظاہر اُنکے مضامین اُردو اور ڈرائنگ کے ساتھ۔ دراصل ہم اپنے گاؤں کے سات ہم جماعت تھے۔ ظاہر ہے کہ اُونچ نیچ تو ہوتی ہے اور تھی بھی۔ ہر سال ایک دو ڈار سے بچھڑ جاتے تھے۔ نئے سال کے لئے اکثریت رائے سے سادہ مضامین کا انتخاب کرتے۔ جماعت نہم اور دہم میں اُردو اور ڈرائنگ / فارسی کا انتخاب ہوا۔ اس کے باوجود میرے بچے کھچے دو ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ دسویں کے امتحان میں صرف میں ہی پاس ہوا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے اباجی مرحوم کے پاس لاہور گیا۔ وہاں الفضل میں Mayo School of Arts کی طرف سے اشتہار تھا کہ انہیں Architect Draftsman کے لئے امیدوار درکار ہیں۔ چار سال کا وظیفہ بھی تھا۔ ان کا مطلوبہ معیار ڈرائنگ کے ساتھ کم از کم سیکنڈ ڈویژن میٹرک تھا۔ اباجی کے ایماء پر میں انٹرویو کے لئے چلا گیا۔ انگریز پرنسپل صاحب (نام یاد نہیں) نے میرے زیادہ نمبروں کو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور سمجھتے ہوئے کھوج لگانے کے لئے سوال پوچھا کہ کیا میں نے امتحان میں نقل کی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ اس کا امکان تو تب ہوتا اگر کسی کے نمبر مجھ سے زیادہ ہوتے۔ تو میں اس طرح چن لیا گیا۔ اور مجھے اگلی سوموار کو کورس شروع کرنے کے لئے کہا گیا۔

اباجی کو آکر بتایا کہ میں اس پروگرام کے لئے چن لیا گیا ہوں۔ مگر میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ میں تو کالج میں پڑھوں گا نہ کہ سکول میں No knowledge without college۔ اباجی نے فرمایا تو ڈاکٹری کرو۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں ڈاکٹری سے کوسوں دُور رہنا چاہتا تھا کیونکہ Cadaver Dissections کرنا پڑتی ہیں اور کم از کم سات سال صبر آزما کوشش اور محنت اس کا لازمہ۔

مجھے اعلیٰ نمبروں کیوجہ سے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل سکتا تھا مگر سائنس کی بجائے Arts کے مضامین پڑھنے پڑتے۔ میرے نسبتی بھائی میجر حمید احمد صاحب کلیم مرحوم نے تاکیداً ثم تاکیداً تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہونے پر زور دیا۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں اور ہمیشہ کے لئے ان کی عنایات اور پیار کے پیش نظر دعا گو۔

اباجی مجھے کالج لے گئے۔ داخلہ کا فارم بھرا۔ مطلوبہ کتابیں خرید لیں اور اللہ تیری یاری۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب بھر سے سات High Achievers مشمولہ منور چونڈہ صاحب۔ سعید رحمانی صاحب اور مرحوم ڈاکٹر عبدالغفور زاہد ہمارے اپنے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے سپوت تھے۔ میرا واسطہ ان چنیدہ طلباء سے پڑ گیا۔ Pre-Medical گروپ میں ڈاکٹر غفور سرفہرست تھے۔ اور میں سائنس مضامین سے بے بہرا۔ Physics Lab میں متعدد بار ساتھیوں (بلکہ حریف کہیں) سے پوچھنا پڑتا۔ پھر بھی Vernier Caliper سے دوستی نہ ہو سکی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرے ساتھیوں نے میٹرک میں سائنس اردو میں پڑھی تھی اور میں نے شروع سے ہی کالج میں انگلش میں پڑھنا شروع کی۔ انہیں اردو میں سوچ کر انگریزی کا رُوپ دینا ہوتا یا پھر اس کا الٹ۔ مجھے اس Dual Process سے استثناء تھا۔

نومبر میں مجھے کالج دفتر میں بلایا گیا اور کہا گیا کہ مجھے مضامین بدلنا ہوں گے کیوں کہ میں نے میٹرک میں سائنس نہیں پڑھی تھی۔ بقول ان کے محترم پرنسپل صاحب (بعد کے خلیفۃ المسیح الثالثؒ) کو بھی گمان تھا کہ زمینداروں کے بچے سائنس نہیں پڑھ سکتے۔ میں نے عرض کی کہ میں اب کتابیں خرید چکا ہوں اور بہت ہی مہربان و شفیق اساتذہ کرام میاں عطاء الرحمن صاحب۔ حبیب اللہ خاں صاحب اور محمود احمد صاحب کی محنت اور دعاؤں سے کچھ نہ کچھ *Scientific* بھی ہو رہا ہوں۔ دسمبر ٹیسٹ تک مہلت دیں۔ الحمد للہ کہ پرنسپل صاحب نے مشروط منظوری مرحمت فرمادی۔

ماہ دسمبر میں جلسہ سالانہ پر میرے عزیز دوست ڈاکٹر عبد الغفور صاحب نے مجھے بلا کر مبارکباد دی کہ میں (واقعی میں) بیالوجی میں فرسٹ آیا ہوں ۱۰۰/۶۲۔ دراصل اکیلا میں ہی پاس ہوا تھا۔ فزکس۔ کیمسٹری اور انگلش میں خاصے اچھے نمبر آئے اور اسلامیات B Group میں فرسٹ آیا۔ اب کیا تھا میرے Premedical Subjects پکے ہو گئے۔ عرض کرتا چلوں کہ خاکسار Day Scholar تھا۔ ۲ سال کے دوران (بلکہ اسکے بعد تعلیمی دَور میں بھی) نہ کبھی لیٹ ہوا اور نہ غیر حاضر۔ ۱۹۵۳/۵۴ء کے کالج کانووکیشن کے موقعہ پر سر چوہدری ظفر اللہ خاں صاحبؓ کے ہاتھ سے Oxford English Dictionary بطور انعام پائی۔

ان واقعات کے مد نظر مجھے سورۃ البقرہ کی آخری آیت اور درخشاں نظر آنے لگی ہے اور Very Forgiving وَاعۡفُ عَنَّا وَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا. داخلہ کے وقت میرے میٹرک میں سائنس نہ پڑھ کر آنے پر پردہ رہنا اور معلوم ہو جانے پر اجازت مل جانا اور پھر فیصلہ کن دسمبر ٹیسٹ میں نمایاں طور پر پاس ہو جانا اَنۡتَ مَوۡلٰنَا کی عملی تفسیر نہیں تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔
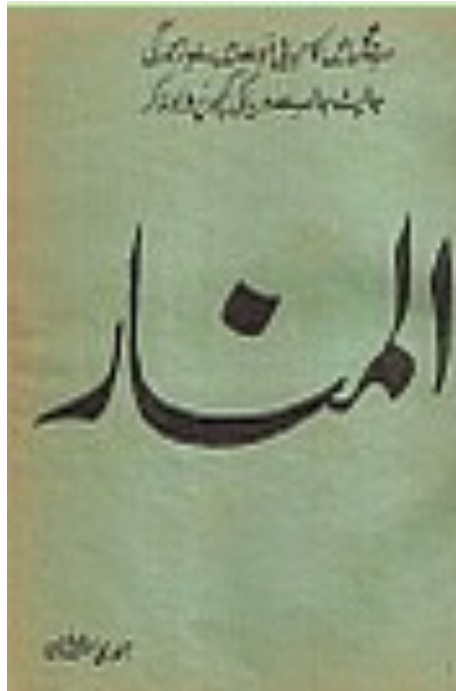
المنار کے یادگار تاریخی شمارے

اب مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کی ویب سائٹ پر آپ کے مطالعہ کے لیے میسّر ہیں

Please visit:

http://ticalumniusa.org/almanar-usa/main/

ذکرِ خیر

پروفیسر چوہدری صادق علی

شاہد احمد ولد چوہدری صادق علی مرحوم، سڈنی۔ آسٹریلیا

پروفیسر چوہدری صادق علی مرحوم

آپ اپریل ۱۹۴۲ء ڈسٹرکٹ جالندھر انڈیا کے گاؤں پرچیاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چوہدری رحمت علی بہت نیک اور دُعا گو بزرگ تھے۔ نماز اوّل وقت میں ادا کرتے اور اگلی نماز کے انتظار میں مسجد میں ہی تشریف رکھتے۔ آپ اپنے ایک احمدی دوست کے توسط سے احمدی ہوئے اور انہی کے ساتھ قادیان جا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کی والدہ بھی بہت نیک خاتون تھیں۔ گو آپ نے اپنے خاوند سے بہت بعد میں بیعت کی۔ لیکن جماعت سے بہت اخلاص اور وفا کا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دونوں ہی بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہیں۔

پارٹیشن کے بعد آپ کا خاندان پاکستان کے ضلع فیصل آباد کے گاؤں گگومال میں رہائش پذیر ہوا۔

چوہدری صادق علی صاحب نے ابتدائی تعلیم ضلع فیصل آباد میں حاصل کی۔ ٹی۔آئی کالج ربوہ سے BSc کی اور MSc کی ڈگری پشاور یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بعد ازاں Botany کے لیکچرار کے طور پر ٹی۔ آئی کالج ربوہ (Join) جوائن کیا۔ اور ۲۰۰۲ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ ربوہ میں پہلے دارالرحمت پھر دارالصدر میں رہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے اپنا گھر بنوایا اور پھر وہاں شفٹ ہو گئے۔ ربوہ میں رہائش کے دوران مختلف جماعتی عہدوں پر خدمت کی توفیق ملی۔ الحمد للہ۔ امیر صاحب آسٹریلیا جب صدر خدام الاحمدیہ ربوہ تھے تو آپ کے ساتھ بھی کام کیا۔ ایک لمبا عرصہ بطور ناظم گوشت جلسہ سالانہ ربوہ کی ڈیوٹی نہایت جانفشانی سے احسن طور پر ادا کرنے کی توفیق پائی۔ (فالحمد للہ)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے دور میں آپ گلشن احمد نرسری ربوہ کے انچارج مقرر ہوئے۔ تزئین کمیٹی ربوہ کے بھی کچھ عرصہ ممبر رہے۔ دفتر وقف جدید میں بھی خدمت کی توفیق ملی۔ ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۷ء تک ایک لمبا عرصہ دارالقضاء ربوہ میں بطور مرکزی قاضی خدمات انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ صائب الرائے تھے۔

ایک دفعہ ایک احمدی جج کے سامنے آپ کا فیصلہ پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے فیصلہ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد پوچھا کہ جن قاضی صاحب نے یہ فیصلہ کیا ہے انہوں نے (Law) کہاں سے پڑھا ہے تو بتایا گیا کہ وہ تو سائنس کے ٹیچر ہیں۔ انہوں نے کبھی (Law) نہیں پڑھا۔ تو وہ جج صاحب بہت حیران ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ یہ ایک بہترین فیصلہ ہے اس میں کوئی جھول نہیں۔ چوہدری صاحب کی اہلیہ بتاتی ہیں کہ وہ یہ واقعہ اکثر بیان کرتے اور بہت خوش ہوتے۔

۲۰۰۷ء میں آپ آسٹریلیاء اپنے بچوں کے پاس شفٹ ہو گئے تھے۔ جہاں پر آپ کو حضور کی ہدایت پر صدر قضاء بورڈ آسٹریلیا مقرر کیا گیا اور آسٹریلیا میں پہلی دفعہ دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا۔ آپ کی اہلیہ بیان کرتی ہیں کہ سادگی، عاجزی اور انکساری آپ کی زندگی کے نمایاں اوصاف تھے۔ آپ خود بھی باقاعدگی سے نماز ادا کرتے اور بچوں کو بھی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کی تلقین کرتے۔

خود بھی خلافت سے بے حد محبت تھی اور بچوں کو بھی ہمیشہ خلافت سے وابستہ رہنے کی تلقین کرتے اور ہمیشہ بچوں کو احساس دلاتے رہتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن نعمتوں سے نوازا ہے وہ سب احمدیت کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے موصی تھے۔ چندہ باقاعدگی سے ادا کرتے اور ہمیشہ ٦ ماہ کا چندہ پیشگی ادا کرتے تھے۔ سیکرٹری مال کو چندہ خود پہنچاتے۔ اس بات کا انتظار نہ کرتے کہ وہ خود چندہ لینے آئیں۔ اپنی وفات سے چند دن قبل اپنے تمام چندہ جات کی ادائیگی (جون ۲۰۱۳ء) تک کر دی تھی۔

اپنے اہل و عیال سے ہمیشہ محبت اور شفقت کا سلوک کرتے۔ رشتہ داروں اور ضرورتمندوں کا بہت خیال کرتے۔ مختلف مواقع پر مالی امداد کرتے ایک موقع پر اپنے بیٹے اور بہوؤں کو بٹھا کر وصیت کے نظام کی اہمیت بتائی اور وصیت کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اللہ کے فضل سے سب اس نظام سے منسلک ہیں۔ ۲۰۱۰ء سے پھیپھڑوں کے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ بیماری بہت زیادہ تکلیف دہ تھی۔ لیکن آپ نے بڑے صبر اور حوصلہ سے بیماری کا سامنا کیا اور کبھی ناشکری کا کوئی کلمہ منہ سے نہیں نکلا۔ اللہ کے فضل سے ہمیشہ خاتمہ بالخیر کی دعا مانگتے۔ آسٹریلیا کے پہلے صدر قضاٗ بورڈ کی حیثیت سے آپ کو تقریباً چھ سال تک خدمت کی توفیق ملی۔ باوجود بیماری کے وفات تک خدمت کا یہ سلسلہ بفضل خدا جاری رہا۔

۱۰ مارچ ۲۰۱۳ء کو آسٹریلیا کے وقت کے مطابق آپ رات ساڑھے دس بجے بقضاء الٰہی وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بعد ازاں مورخہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۳ء بعد نمازِ عصر بیت الھدیٰ آسٹریلیا میں محترم امیر مشنری انچارج آسٹریلیا نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آسٹریلیا میں ہی قطعہ موصیان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ بوقت وفات آپ کے تینوں بیٹے آپ کے پاس تھے۔ آپ نے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔ تینوں بیٹے آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ ایک بیٹی جرمنی اور دو بیٹیاں UK میں ہیں۔ چھوٹے بیٹے کے علاوہ سب شادی شدہ اور اللہ کے فضل سے صاحب اولاد ہیں۔

دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ان کی نیکیاں ان کی اولاد میں بھی جاری فرمائے اور سب پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

مجلس طلباء قدیم امریکہ کے چند ممبران
عید ملن کے موقع پر
۲۵ اگست ۲۰۱۲ء لال قلعہ ریسٹورنٹ بالٹی مور، میری لینڈ

بیٹھے ہوئے: (دائیں سے بائیں) سفیر رامہ، راجہ ناصر احمد، اسلم پرویز چوہدری، صفی اللہ چوہدری، امجد قریشی
کھڑے ہوئے: (دائیں سے بائیں) حلیم چوہدری، شاہد احمد، ناصر جمیل، چوہدری مشتاق احمد، ڈاکٹر امتیاز احمد، اقبال خان، لطیف خلیل

مکرم پروفیسر چوہدری صادق علی صاحب مرحوم اور کالج کی یادیں

محمد شریف خان

صادق صاحب بھی چلے گئے ! یہ گھر ہی جائے فنا ہے، آج تو کل مَیں، یہ تانتا قیامت تک یونہی بندھا رہے گا، باقی رہے نام اللہ کا!

چوہدری صادق کو مرحوم کہتے ہوئے اور بیالوجی لیکچر روم میں اُن کی مخصوص کرسی کو چشمِ تصور میں خالی دیکھتے ہوئے دل سے ہوک اٹھتی ہے۔ جب میں کالج سے ستمبر ۱۹۹۹ء میں رخصت ہوا تو چوہدری صادق نے اُسی کرسی سے اُٹھ کر بغلگیر ہو کر الوداع کہا تھا۔ دھیمی مربیانہ گفتگو اور صاف شفاف شخصیت، دل میں اُتر جانے والی گہری نظر، بول تول کم لیکن بے دھڑک، واہ کیا مجاہد آدمی تھا!

صادق مرحوم سے میرا شریک کار ہونے کے علاوہ استاد اور شاگرد کا تعلق بھی تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب لیکچرر کے طور پر تعلیم الاسلام کالج میں میری تقرری ہوئی تو صادق مرحوم تھرڈ ایئر ذوالوجی میں میرے طالبعلم تھے، ان کے ساتھ ملک منور مرحوم کے بڑے بیٹے طاہر ملک مرحوم تھے۔ صادق نہایت کم گو، سنجیدہ، اور سیانے قسم کے طالبعلم تھے۔ جب کوئی مشکل ہوتی بلا جھجک سوال کر لیتے۔ مجھے کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کرنے کے بعد میرے شریک کار ہوئے تو بھی ہمیشہ مجھے استاد کا پروٹوکول ہی دیا۔ اگر کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو بلا تکلف پوچھ لیتے۔ انہیں دنوں بیالوجی کا کورس تبدیل ہوا تھا اور امریکن کتاب جسے عرفِ عام میں yellow version کہا جاتا تھا، متعارف کرائی گئی۔ جیسے کہ امریکنوں کی ٹیکسٹ کا سٹائل ہوتا ہے ایک پیرے کی تشریح میں پورا باب لکھ دیا جاتا ہے، ہمارے ہاں تو ایک مسئلے کو چند سطروں میں سمو دیا جاتا ہے اور ہمارے دودھ دہی کے پلے طلباء پندرہ منٹ میں اسے یاد کر لیتے ہیں لیکن نئی کتاب سے کافی مسائل پیدا ہوئے۔ بہر حال ایک دو سال میں ہم پنجابیوں نے نوٹس کا سہاگہ چلا چلا کر امریکی کتاب کے پہاڑوں کو برابر کر دیا۔

چوہدری صادق مرحوم بڑے دلنشین انداز میں ہر طالب علم کے لیول پر اتر کر سبق سمجھاتے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ایرک سپرین جیسے عالم کی انگریزی تقریریں پنجابی لہجے میں سنی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر طالبعلم انگریزی زبان کو اس لہجے میں زیادہ آسانی سے سمجھتے تھے جو پنجابی سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسی لیے جو اساتذہ اس انداز میں پڑھاتے تھے ان کے شاگرد خوش رہتے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے، چوہدری صاحب کے شاگرد ہمیشہ آپ سے خوش رہے۔

چوہدری صاحب مرحوم کو خداداد جرأت عطا ہوئی تھی، سوچ سمجھ کر لیکن دو ٹوک بات کرتے جو سننے والے کو بری بھی نہ لگے۔ ہم سب گھر داروں کو نہ سہی لیکن اکثر کو گوشت کی دکان پر قصاب سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ چوہدری صاحب مرحوم کو باتوں باتوں میں ان کائیاں حضرات کو شیشے میں اتارنے کا ڈھب آتا تھا، اس لیئے بہترین گوشت خریدا کرتے تھے۔ جلسہ سالانہ پر صرف ایک دفعہ میری اور پروفیسر شکور اسلم صاحب کی ڈیوٹی اربابِ حل و عقد نے گوشت سپلائی پر شاید اس لئے لگائی تھی کہ ہمارا شعبہ حیوانیات zoology سے تعلق تھا، لیکن ہوا یہ کہ ہم دونوں سیانے بیانے بڑی آسانی سے قصابوں کے داؤ پیچ کا شکار ہو گئے، اور انتظامیہ کو یقین ہو گیا کہ ایں سعادت بزورِ 'علم' نیست !

لیکن چوہدری صاحب کو جانے کیا کمال حاصل تھا کہ سالہا سال تک یہ ڈیوٹی بطریق احسن ادا کرتے رہے۔ قصابوں کی تیز چُھری چوہدری صاحب کی میٹھی چُھری سے سالوں خوشی خوشی کٹتی رہی، گوشت کی کوالٹی بہترین اور ارزاں مہیا ہوتی رہی۔۔۔۔ ہوتا یوں کہ چوہدری صاحب قصابوں کے ساتھ جلسہ سالانہ سے پہلے منڈی مویشیاں کا چکر لگاتے، اور اچھے اچھے جانور خرید کر ٹرکوں میں لاد کر ربوہ پہنچا دیتے جہاں انکی خوش خوراکی کا خیال رکھا جاتا، ایک دو ہفتے میں، جانور خوب پل جاتے اور جلسہ کے مہمانوں سے گوشت کی عمدگی کی رپورٹ ملتی۔

تعلیم الاسلام کالج کے سینئر اساتذہ کی جمعہ پارٹی میں میاں خورشید، سلطان اکبر، چوہدری محفوظ، میاں انس، چوہدری حمید، شریف خالد وغیرہ شامل تھے۔ نماز عصر کے بعد کسی ایک پروفیسر کے گھر دعوت کا اہتمام ہوتا اور خوب گپ شپ ہوتی۔ جبکہ

جونیئر پروفیسر صاحبان کی محفل میں چوہدری سلطان، چوہدری صادق، مبارک عابد، میجر نذیر (جیرا)، سعید چٹھہ، شاہد باجوہ اور جو کوئی ہاتھ آتا شامل کر لیا جاتا۔ یہ محفل بھی روٹیشن میں بیٹھکوں میں ہوتی۔ عام طور پر شام کے کھانے کا اہتمام ہوتا جو اکثر چوہدری صادق کے ہاتھ کا پکا ہوا ہوتا۔ مجھے بھی اس محفل میں ایک دفعہ شمولیت کا موقعہ ملا۔ ایسا محبت بھرا ماحول اور محفل دیکھے اب تو مدت گزر گئی ہے۔ تیسری محفل فری لانسرز کی تھی، جس کے روحِ رواں بشیر رفیق خان تھے، اس میں میرے علاوہ عبدالرحمان شاکر، ملک صفی اللہ، مربی ترکی ڈاکٹر عبدلغفار شامل تھے۔ یہ ہلکی پھلکی پارٹی ہوتی، گرم گرم پکوڑے، حلوہ اور کوئی دوسری چیز ہوتی جو خاتونِ خانہ بنا سکتی۔ عموماً اس محفل میں زیادہ تر علمی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ میں اپنی تحقیقی کاوش میں مشغول عام طور پر ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے اکثر محروم رہتا تھا۔

اس کے علاوہ ہر روز کالج کے اوقات کے دوران بیالوجی لیکچر روم میں بھی ایک محفل سجتی جس کے سرخیل پرویز پروازی تھے۔ حبیب الرحمٰن شاہ، چوہدری صادق، آفتاب احمد، مبارک عابد اور محروموں میں شکور اسلم، رشید غنی اور خاکسار ہوتے۔ ہم باتوں سے لطف اندوز ہوتے اور کبھی کبھی کوئی پکوڑا، یا بسکٹ چکھ لیتے البتہ غنی اور شکور چائے نوشی میں ضرور شریک ہوتے۔ اس وقت میڈیکل سائنس اتنی طالبان نہیں ہوئی تھی کہ سگرٹ کے دھوئیں پر passive smoking کا فتویٰ جڑ دیتی۔ لعل دین، شادی یا کوئی اور ٹک شاپ سے تام چینی کی ہاف سیٹ والی چینک اور کناروں سے زخمی ہوئی چھ ملگجے رنگ کی پیالیوں اور ایک پرچ میں سات آٹھ میٹھے نمکین سفیدی مائل بُھربُھراتے سے بسکٹ اور کبھی کبھی گرم گرم سموسے یا پکوڑے، پانی ٹپکاتی لوہے کی ٹرے میں سجا کر سپلائی کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں، گھنٹی کی آواز پر خالی پرچ میں راکھ اور ٹرے میں اُدھار کی چٹ چھوڑ کر یہ محفل منتشر ہو جاتی۔

یہ یاد کرکے کہ کالج کی nationalization کے بعد ہمیں کن کن طور و اطوار کے پرنسپل صاحبان سے واسطہ پڑا جو ایک دو نہیں پورے بارہ تھے تو یقین نہیں آتا۔ اب سوچتا ہوں، ہم جو تعلیم الاسلام کالج میں جاری و ساری محبت و توقیر کے ماحول کے عادی تھے جس کا ذکر ابھی گزرا ہے، ہمارے لیے یہ کیسا کڑا وقت تھا۔ جب ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ہر لمحہ، ہر دن ہماری نیک نیتی کا امتحان ہوتا۔ ہم جو مدتوں سے کالج سے چھٹی کے بعد بھی شام گئے تک کالج میں ٹھہر کر کام کرتے رہنے کے عادی تھے، اب نوبت بہ ایں جا رسید کہ پیریڈ پڑھایا اور سائیکل پر سوار یہ جا وہ جا۔ اس وقت ہم کالج میں اپنے دن گنا کرتے تھے۔ لیکن صادق جیسے ساتھیوں کی معیت میں یہ وقت بھی گزر گیا۔ ایک گیم شیم پرنسپل صبح ایکسپریس ٹرین کے ذریعے سرگودہا سے کالج تشریف لاتے تھے۔ موصوف کو منہ بگاڑ بگاڑ کر اپنے کپڑوں پر اتراتے ہوئے بات کرنے کا شوق تھا اور انہیں Reader's Digest کا قاری ہونے پر بڑا فخر تھا۔ ہم انکی بچگانہ حرکتوں پر ہنستے اور انکی باتوں کو بادلِ نخواستہ سنا کرتے۔ یہ پیپلز پارٹی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ غلام مصطفےٰ کھر پنجاب کے گورنر تھے۔ وہ سردیوں میں اکثر ٹی وی پر ایک کیمل کلر چادر میں بُکل مارے ہوئے نظر آتے۔ ایک دن پرنسپل صاحب بھی اسی طرز کی چھوٹی سی "چُنری نما" چادر لپیٹے کالج تشریف لائے۔ جو بھی جاتا اِس "چادری" کی تعریف و توصیف سن کر آتا۔ اتفاقاً چوہدری صادق اور سلطان احمد بھی کسی کام کے سلسلے میں پرنسپل سے ملنے گئے۔ صاحب نے حسبِ عادت اپنی چادر کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو صادق نے برجستہ پنجابی میں پوچھا ' چوہدری صاحب، ایہہ چھوٹی جئی چُنی پالا کیویں لاندی اے! یہ سننا تھا کہ جناب پرنسپل صاحب آگ بگولا ہو گئے، بولے "صادق تمہیں بات کرنا نہیں آتی، میں تمہیں ٹرانسفر کروا دوں گا۔۔۔۔" وغیرہ۔ اور پھر اس سلسلے میں دفتری کارروائی شروع کر دی۔ ہم سب پریشان! حضور کی خدمت میں دعا کے لیے لکھا، ارشاد ہوا: "یہ خود ہی ذلیل ہو گا"۔ چنانچہ موصوف نے صادق علی کی تین دفعہ ٹرانسفر کروائی جو تینوں بار رک گئی۔ آخر چند دنوں بعد خود اسے لاہور سے سیکریٹری ایجوکیشن کو ملنے کا آرڈر پہنچا۔ وہاں کیا گزری، موصوف خود ہی راوی تھے: "نو بجے سے چھٹی تک مجھے انتظار کرایا، اور میں ذلیل و خوار باہر چپڑاسی کے ساتھ بیٹھا بلاوے کا منتظر رہا۔ میری توبہ" بس اس ایک جھٹکے نے موصوف کو زمین بوس کر دیا۔

صادق مرحوم ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۹ء میری ریٹائرمنٹ تک میرے شریک کار رہے، مجھ سے اور دوسرے اساتذہ سے ان کا سلوک ہمیشہ بہترین رہا۔ انکی یاد ہمیشہ دل کو گرماتی رہے گی، اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

قرارداد تعزیت بر وفات پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب

محترم پروفیسر سلطان محمود شاہد کی وفات کی خبر سننے پر مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام، امریکہ نے ٹیلیفون کانفرنس کے ذریعے ہنگامی اجلاس بلایا جس میں مرحوم کے، بیٹوں اور بیٹیوں نے بھی شرکت کی۔ مرحوم شاہ جی کے بیٹے مکرم پروفیسر سید برہان احمد اور دونوں بیٹیاں محترمہ راشدہ احمد صاحبہ اور محترمہ بشریٰ ناصر صاحبہ پاکستان سے شامل ہوئے، اور دوسرے صاحبزادے نعمان احمد، امریکہ سے شامل ہوئے۔ انہوں نے اپنے پیارے اور مشفق "ابی" کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے حاظرین کو اشکبار کر دیا۔ مرحوم کے شاگردوں نے اُن کیساتھ اظہارِ تعزیت اور شاہ جی مرحوم کو یاد کرتے ہوئے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ مرحوم کے لئے دعا کی اور درجِ ذیل تعزیتی قرار داد منظور کرنے کے ساتھ یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قراردادِ تعزیت

ہم طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ ایس۔ اے، اپنے محترم استاد اور خادم سلسلہ معروف ماہر تعلیم مکرم پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب مرحوم و مغفور کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم 16/اکتوبر 1933ء کو شاہ مسکین ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت سید سردار احمد شاہ صاحب صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کی پیدائش سے پہلے ہی آپکو وقف کر دیا تھا۔ آپ نے بی۔ ایس۔ سی اسلامیہ کالج لاہور سے، اور ۱۹۴۶ء میں ایم۔ ایس۔ سی کیمسٹری کی ڈگری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ قادیان حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کا تقرر بطور لیکچرار کیمسٹری تعلیم الاسلام کالج قادیان میں ہوا۔ آپ تعلیم الاسلام کالج کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے۔

آپ نے 1958ء میں یونیورسٹی آف لندن سے آرگینک کیمسٹری میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی، اور 1964ء میں اسی یونیورسٹی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کیا اور رائل انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل سوسائٹی کے فیلو چنے گئے۔ 1964ء تا 1978ء تعلیم الاسلام کالج میں پروفیسر، ہیڈ آف کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ اور کچھ عرصہ انچارج پرنسپل رہے۔

مرحوم شاہ صاحب کی تعلیمی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں، آپ کے لاتعداد شاگرد آج پنجاب کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کیمسٹری کے اساتذہ کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی آرگینک کیمسٹری سے متعلق درجِ ذیل چھ کتب ایف۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایس۔ سی کے نصاب میں 1953ء سے 1973ء تک شامل رہیں:

1- Standard College Chemistry for F.Sc., 2-Standrad College Chemistry for B.Sc., 3- Organic Chemistry for B.Sc.,4-Modern Practical Chemistry for F.Sc. 5- Chemistry Made Easy for F.Sc.

محترم ڈاکٹر صاحب نہایت سادہ اور ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ تعلیمی معاملات میں ضرورتمند طلباء کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے، ہر ایک کے ساتھ محبت اور پیار اور لگاؤ کا سلوک تھا۔ مخلصانہ مشورے دیتے اور طلباء کے مسائل ذاتی دلچسپی لے کر حل کرواتے۔ آپ کی جماعتی خدمات بھی یادگار ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے ساتھ ٹی آئی کالج ربوہ کے زمانہ میں خاص تعلق رہا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے ساتھ بھی گہرا تعلق تھا۔

ہم طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ ایس۔ اے مرحوم کے تمام لواحقین، آپ کے صاحبزادوں، مکرم پروفیسر سید برہان احمد ناصر صاحب، مکرم سید نعمان احمد صاحب اور اُپ کی صاحبزادیوں محترمہ راشدہ احمد صاحبہ اہلیہ مکرم سید احمد شاہ صاحب اور محترمہ بشریٰ ناصر صاحبہ اہلیہ مکرم نامدار احمد ناصر صاحب سے انتہائی دکھ اور غم کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے، اپنے مقربوں میں جگہ عطا فرمائے، آپکی دعاؤں کا فیض جاری رکھے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(اراکین مجلس عاملہ طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ ایس۔ اے)

قرارداد تعزیت بروفات پروفیسر صادق علی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قراردادِ تعزیت

ابھی محترم پروفیسر سلطان محمود شاہد کی وفات کی خبر تازہ تھی کہ مکرم پروفیسر صادق علی صاحب کی وفات کی خبر سننے کو ملی۔ مرحوم آسٹریلیا میں بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور کچھ عرصے سے بیمار تھے۔ ۱۰ مارچ ۲۰۱۳ء کو وفات پا گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

ہم طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ پروفیسر صاحب مرحوم کی محترمہ بیگم صاحبہ اور بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ اظہار تعزیت کرتے ہیں۔

مرحوم ایک مشفق اور قابل استاد تھے۔ آپ کی دھیمی اور منکسر المزاج طبیعت آپ کے رفقاء کار اور شاگردوں کے ذہنوں میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ آپ جماعت میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ جلسہ سالانہ کے دوران آپ کئی سال ناظم گوشت کی ڈیوٹی دیتے رہے۔ ہم مرحوم کے بلندیء درجات کے لئے دست بدعا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مجلس عاملہ وارا کین طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ایس۔اے

قرارداد تعزیت بروفات چوہدری محفوظ الرحمٰن صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قراردادِ تعزیت

ہم طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ایس۔اے، محترم چوہدری محفوظ الرحمن صاحب سابق لائبریرین تعلیم الاسلام کالج ربوہ مرحوم ومغفور کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

تعلیم الاسلام کالج کی معروف، ہر دلعزیز شخصیت اور دیرینہ خادم سلسلہ محترم چوہدری محفوظ الرحمن صاحب جنوری ۱۹۲۰ء میں حضرت چوہدری عنایت اللہ صاحبؓ، صحابی حضرت مسیح موعودؑ، آف بہلولپور ضلع نارووال کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے ایف اے گورنمنٹ کالج پسرور اور بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ آپ کوالیفائیڈ لائبریرین تھے۔ جب آپ دہلی میں ملازمت کر رہے تھے تو حضرت مصلح موعودؓ کی نوجوانوں کو وقف زندگی کی تحریک پر آپ ملازمت چھوڑ کر قادیان آ گئے اور اپنی زندگی وقف کر دی۔ قادیان میں بطور انسپکٹر مال خدمت کی توفیق ملی پھر آپ کو تعلیم الاسلام کالج لاہور میں بطور اکاؤنٹنٹ' ٹی آئی کالج ربوہ میں بطور D.P.E اور لائبریرین لمبا عرصہ خدمت کی توفیق ملی۔ کچھ عرصہ نائب انچارج خلافت لائبریری ربوہ بھی رہے۔ نصرت جہاں اکیڈمی میں بھی بطور D.P.E اور لائبریرین خدمت کی توفیق پائی۔

اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر جماعتی خدمات کی توفیق ملتی رہی۔ مہتمم صحت جسمانی مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ رہے۔ ربوہ میں جو پہلا قافلہ بھجوایا گیا آپ اس میں شامل تھے۔ حضرت مصلح موعود کی حفاظتی ڈیوٹیاں دینے کا بھی موقع ملتا رہا۔ ۱۹۵۳ء میں حضرت مصلح موعودؓ کوئٹہ دورہ پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں فسادات شروع ہو گئے۔ اس وقت جن افراد کو فوری طور پر کوئٹہ ڈیوٹی کے لئے بھجوایا گیا ان میں بھی آپ شامل تھے۔ اور حضور کی واپسی پر آپ حفاظتی دستہ میں شامل تھے۔

آپ شریف النفس، ہمدرد، غریب مزاج، اور طلباء کیساتھ انتہائی شفقت کرنے والے تھے۔ آپ فٹ بال اور والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ آخری عمر تک نماز بیت الذکر میں ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہم طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج یو۔ایس۔اے محترم چوہدری محفوظ الرحمن صاحب کے پسماندگان، آپکی اہلیہ محترمہ نصرت صاحبہ بنت محترم چوہدری علی اکبر صاحب گھڑیال کلاں ضلع شیخوپورہ۔ اور آپکے صاحبزادگان مکرم چوہدری وسیم احمد صاحب صدر مجلس انصار اللہ یو کے اور مکرم چوہدری رفیع احمد طاہر صاحب کارکن دفتر وصیت ربوہ کے ساتھ اظہارِ تعزیت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ مغفرت کا سلوک فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے نیز آپ کی نیکیاں جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمیل الرحمٰن
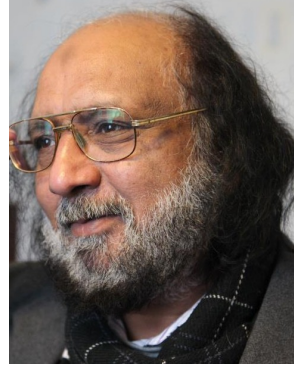
وہ رنگِ لازوال ابھی یاد ہے مجھے
وہ قریہء غزال ابھی یاد ہے مجھے

ہر صبح جس کی دید سے تازہ ہوئی نظر
دامن پہ جس کے ضوفشاں تھے علم کے گہر
جس میں بچھا دئے تھے فرشتوں نے اپنے پر

وہ مکتبِ کمال ابھی یاد ہے مجھے
وہ قریہء غزال ابھی یاد ہے مجھے

وہ مہرباں اساتذہ۔۔۔وہ علم کے چراغ
پُر روشنی سے جن کی ہوئے فکر کے ایاغ
سادہ مزاج عالی نظر صاحبِ دماغ

سب تھے ملک خصال ابھی یاد ہے مجھے
وہ قریہء غزال ابھی یاد ہے مجھے

کوئی چہرہ کوئی عکسِ شام یاد آتا نہیں
اب وہ حسن تام تیرا بام یاد آتا نہیں

آئینے میں جب کبھی دیکھا ہے اپنے آپ کو
غور کرنے پر بھی کوئی نام یاد آتا نہیں

میں بھی کم کم دیکھتا ہوں کچی عمروں کے وہ خواب
کیا تمہیں بھی اب وہ ربطِ خام یاد آتا نہیں

جو تعلق تجھ سے تھا اس عمر کی ڈھلوان پر
یاد تو آتا ہے صبح و شام یاد آتا نہیں

آ گئے گھر سے نکل کے ہم کسی پیغام پر
کس کی جانب سے تھا کیا پیغام یاد آتا نہیں

احمد مبارک

میں بھی تھا کر رہے تھے جہاں سارے گفتگو
پر مُجھ سے اُٹھ نہیں سکا وہ بارِ گفتگو

ٹھہرا دیا گیا ہوں گناہ گارِ گفتگو
حالانکہ کر رہا تھا میں انکارِ گفتگو

نکلے گا بیچ سے وہی عیارِ گفتگو
اُترے جو ایک دن تری دستارِ گفتگو

پہلے تو کر دیا گیا سب کچھ تہس نہس
پھر اُس پہ کھینچ لی گئی تلوارِ گفتگو

خوشبوئے معنی رقص کناں ہے ہوا کے ساتھ
کس نے کھلا دئے گل و گلزارِ گفتگو

تب کُھل کے مل سکیں گے سرِ بزمِ خامشی
ٹوٹے کبھی جو بیچ کی دیوارِ گفتگو

اِس خاکِ رفتگاں پہ سنبھل کے خرام کر
بکھرے ہیں جا بجا یہاں آثارِ گفتگو

کوئی بُلا کے لاؤ کہ ہے خامشی بہت
جانے کہاں گئے ہیں مرے یارِ گفتگو

اکرم ثاقب

وہ شہر ناگہاں بدلا نہیں ہے
غموں کا سائباں بدلا نہیں ہے

میرا نیزے پہ سر رکھا گیا ہے
مگر میرا بیاں بدلا نہیں ہے

مسلسل بات کرتا ہے وہ مجھ سے
ابھی تک وہ چناں بدلا نہیں ہے

سُنا ہے میرے کتبے گِر رہے ہیں
کہ راوی داستاں بدلا نہیں ہے

سُنا ہے بھوک اُگتی ہے لہو میں
سُنا ہے باغباں بدلا نہیں ہے

جھلستی جا رہی ہیں میری نسلیں
وہ خورشیدِ تپاں بدلا نہیں ہے

ابھی بھی وقت ہے آ جا گلے مِل
کہ میں نے کارواں بدلا نہیں ہے

اُجڑ کر رہ گئی ہے ساری بستی
مگر میرا امکاں بدلا نہیں ہے

صادق باجوہ

کروں نذر ایسی نظر کو کیا جو نظر نظر میں سما گئی
تری یاد کتنی عجیب ہے جو دل و دماغ پہ چھا گئی

تری آرزو، تری جستجو ہوئی گومگو پھری کو بکو
غمِ ہجر کے بڑھے سلسلے مرے نیر کتنے بہا گئی

وہ حیات کا کوئی باب تھا، کوئی خواب تھا کہ سراب تھا
بڑی چاہتوں کا حساب تھا، تری یاد وہ بھی مٹا گئی

کوئی بے پناہ سی چاہ تھی، رہِ ظلم و جور تباہ تھی
کسی بے نوا کی وہ آہ تھی، سرِ شام حشر جگا گئی

جو غموں کو دل سے لگا لیا تو جہاں کو اپنا بنا لیا
جو طلب تھی اس سے سوا دیا یہ حیات مژدہ سنا گئی

شبِ غم طویل سہی مگر، ہیں نویدِ صبح کے منتظر
یہی جھِلملاتی ہوئی سی لَو کئی مشعلیں ہے جلا گئی

جو خلوصِ دل کی ملے رمق، سمجھ اسکو صادؔق عطائے حق
یہی راہِ صدق و وفا تو ہے مری زندگی جو بنا گئی

مہدی علی

اے ذوالمنن! اے مہرباں!
اس سے پہلے کہ میرے گناہ
میری نیکیوں سے بڑھ جائیں
اور ہو جائے یہ وجود میرا
تیری دھرتی پہ بوجھ کی مانند
اس سے پہلے کہ ہو کے بے بس میں
کسی انسان کو سجدہ کر ڈالوں
اس سے پہلے کہ تیرا فضل و عطا
مجھ سے ہونے لگے گریزاں تو
پاس اپنے مجھے بلا لینا
اس جہاں سے مجھے اٹھا لینا
اپنی بخشی ہوئی حیات اے خدا
میری سانسوں سے تو چرا لینا
اور بھلا کر میری خطاؤں کو
اپنی قربت میں تو بٹھا لینا
اپنی جنت میں تو بسا لینا
اے ذوالمنن! اے مہرباں!

MY STORY

Shafiq-ur-Rahman Nayyar

(s/o Late Prof Mian Ata-ur-Rahman), Houston, Texas

This is the true story of a person who was born in Bhera (District Sargodha, Pakistan); received his early education in Rabwah; went to the Engineering University Lahore, Pakistan to earn his B.S.E.E (with specialization in Electronics & Communications Engineering); and came to the United States for higher education in November 1978. All my accomplishments are living examples of acceptance of prayers and are dedicated to my late parents, teachers and professors. I spent four years of my life (Pre-Engineering) in T.I. College Rabwah, and I am very proud of it.

It is our family tradition to consult with the Khalifatul-Masih before making every important decision. My parents imparted to us the importance of seeking divine guidance and having a direct and strong relationship with KhalifatulMasih. I would like to emphasize this fact with great honor and pride that I have not made any important decision without the consultation and guidance of the Khalifatul Masih. I would like to acknowledge that Hazrat Mirza Nasir Ahmad (Khalifatul Masih III) and Hazrat Mirza Tahir Ahamd (Khalifaul Masih IV) treated me very affectionately and guided me throughout my life. I was very open with them and always sought their guidance before making any critical decision of my life.

> *My parents imparted on us the importance of seeking divine guidance and having a direct and strong relationship with Khalifatul Messiah. I would like to emphasize this fact with great honor and pride, that I have not made any important decision without consultation and guidance from the Khalifa-tul-Massiah.*

My father also introduced me to several of the Companions of the Promised Messiah for my spiritual and moral training, including Dr Hashmatullah Khan, Hafiz Mukhtar Ahmad Shahjahanpuri (ra) and Ali Mohammad B.A. B.T. To this day, I remember going to Hazrat Ghulam Rasool Rajeki (ra) for seeking special prayers to succeed in my examinations. It was engrained in our hearts and minds that our biggest asset is the 'Silent Prayer' and that we should pray to Almighty God and then put all the best efforts to pursue our goals.

I owe a lot to my late father Prof. Mian Ataur Rehman sahib who introduced me to his colleagues Dr. A. B. Paul, Dr. Nazir Chaudhry, Dr. Rafee, Dr. Nazir Ahmad, Dr. Altaf Hussain Querashi and Qazi Mohammad Aslam sahib of Lahore. All of these scholars inspired me to aim high and pursue excellence. My father also introduced me to Dr. Syed Bahadar Ali Shah, a well-known physician, who treated me in 1969 when I was seriously ill due to typhoid. I am also thankful to late Dr. Naseer Ahmad Khan for introducing me to Dr. Islam Shiekh who was Vice Chancellor (VC) of Engineering University, Lahore. Both were good friends and they obtained their doctorate degrees in England. This introduction gave me direct access to the VC and made my five years stay comfortable. Besides that, I was lucky to have a maternal uncle as faculty member in the Engineering University Lahore.

I joined the Electrical Engineering Department of Engineering University in 1973. One-fourth of my colleagues were from EME Corp (Defense Nominees).

I was very lucky that I was selected for Saigol Foundation National Talent Scholarship. It is noteworthy that five Ahmadi students, both male and female, were selected by Saigol Foundation that year. It was a great honor and divine blessing for me. We were asked on the very first day to introduce ourselves. Most of my class-fellows were from Hassanabdal, Burnhall, Lawer-

ence College Murree and Government College Lahore. When I was asked to introduce myself, I announced that I was from T.I. College Rabwah. At this, my professor intervened and warned the Abdalians that they should watch out for me. This is the kind of reputation of T.I. College Rabwah had. This also showed me that previous Ahmadi students had established a good track record and have paved the path for me. My five years stay was pleasant and full of many achievements. My time at Engineering University was also a training period for me to learn how to coexist and get along with others under difficult circumstances. Though I have lived in the United States of America for more than thirty-four years, I still miss my friends, class-fellows, professors, neighbors, hostel staff and people who helped and served me in the hostels.

During 1974, like other Ahmadi students, I also went through challenging times at Engineering University Lahore. We had to take some of our exams at F.C. College & Fortress Stadium in Lahore. I spent a couple of months in Ahmadiyya Hostel in New Muslim Town, away from our hostels. All of the Ahmadi students in Engineering University were very bright and they earned the respect of non-Ahmadi class-fellows. The non-Ahmadi students used to come to us to get help in assignments and final exams. Later on, we earned their respect and confidence to such a degree that they used to inform us well ahead of time in case of any disturbance on campus. But there was a deep and unknown fear in the hearts and minds of our Jamaat-e-Islami class-fellows. A Civil Engineering student that I knew, who was very weak in studies yet a prominent student leader, had an open conversation with me. His sincere advice was that I should leave Pakistan following my graduation. In his opinion, the Jamaat-e-Islami preferred us to sweep the streets of Lahore rather than serve our country as engineers, regardless of how qualified we were.

A Civil Engineering student that I knew, who was very weak in studies yet a prominent student leader, had an open conversation with me. His sincere advice was that I should leave Pakistan following my graduation. In his opinion, the Jamaat-e-Islami preferred us to sweep the streets of Lahore rather than serve our country as engineers, regardless of how qualified we were.

I graduated from Engineering University Lahore in Sept 1978 and began the process of obtaining an immigration visa for USA for which I needed an Affidavit of Support. I would like to acknowledge late Dr. S.D. Shams and Dr. Ata-ur-Rahman Chaudhry for giving me the Affidavit of Support to fulfill the requirements for the immigration visa. I obtained the immigration visa in mid-October 1978, and was planning to leave during the first week of November 1978. Keeping with my family tradition, I went to Rabwah to meet Hazrat Mirza Nasir Ahmad Khalifa-tul-Masih III to seek his permission and guidance for the trip to the USA for higher studies. My elder brother Lutful Mannan had done the same when he left for higher education in the USA in 1969. In those days, Hazoor was confined to bed due to a back injury related to a horse accident. I was with my elder brother and had seen that Mulaqat with my own eyes and had heard the special instructions Hazoor gave to my brother before his departure to the USA. It left an unforgettable impression on my mind about the interest that Hazoor has expressed about the family member of a devotee of Jammat-e-Ahmadiyya.

I met Hazoor in his office with his staff. I am thankful to late Latif Khan sahib for making special arrangements for this Mulaqat. Hazoor asked me about my departure date which was 4th Nov 1978 from Lahore. Then he advised me to hand carry a special letter for late Dr. Muzzafar Ahmad of Chicago Jammat. Hazoor instructed his staff to send a telegram to Dr. Muzaffar to inform him that I would be carrying Hazoor's personal letter for him. I was instructed to deliver the letter and send a telegram to Hazoor after delivery. I started my journey from Karachi by Air France on a direct flight to Paris. While flying over Tehran, there was an unusual stop to pick up some passengers. Later on, I came to know that some of Shah's family members flew in the same flight to Paris. The shutters of plane were dropped and the passengers were hastily picked up. I changed the flight in Paris and headed to JFK. I completed my immigration at JFK and flew to Chicago that evening. Late Dr. Salahud Din Shams received me at Chicago airport and took me

to his residence. I am very grateful to late Dr. Salahud Din Shams who received me at the airport and helped me in delivering Hazoor's personal letter to Dr. Muzzafar.

Like any new immigrant, I also met several challenges soon after my arrival in the USA. I would like to share some of those challenges. After my arrival in Chicago, I moved to Wisconsin and began applying for admission to different universities. In Wisconsin, I worked in a small bakery which enabled me to polish my communication and social interaction skills with the friendly customers. This was also one of the biggest tests for my ego because I had to work at the minimum wage like any other unskilled worker. I consulted with close family friends in Wisconsin and Chicago about my future. I had two options: Get into workforce with my Pakistani degree (which would not be well rewarding down the road) or spend two to three years of my life in a Graduate school to earn Master's degree and then get into workforce with the certainty of success in my future. Since I was single and was determined to succeed, I opted to enroll in Graduate school. I worked for six weeks and moved to Laramie, Wyoming, with couple of hundred dollars to start a new phase of my life.

The next big challenge was 'cultural shock' of language barriers, new social interactions and a new lifestyle. The form of language that I was taught was the British-style of English which was different from the English spoken by my American colleagues. Thanks to my classmates, I overcame my cultural shock and language barrier by learning the local slang from them.

The next big challenge was 'cultural shock' of language barriers, new social interactions and a new lifestyle. The form of language that I was taught was the British-style of English which was different from the English spoken by my American colleagues. Thanks to my classmates, I overcame my cultural shock and language barrier by learning the local slang from them. Also, I did not know how to drive a car, sign an apartment lease, pay bills or open a bank account. I needed those skills when I went to Rocky Mountains in Wyoming for my graduate studies. While there, I noticed that there were many other Pakistani students from rich families who were not good in their studies and were spoiled brats. They all lived in the dormitories with their girlfriends. Fortunately, I was not one of those people and was lucky to be a roommate in the basement of a small house with a very nice and intelligent friend who had very strong moral values. Mr. Hassey, a retired railroad worker, was our landlord. I cannot recall a single unpleasant incident during my stay of two years, and for that, I admire him.

Later on, I moved to Laramie where the climate was very harsh. The Snowy Mountain Range was only thirty miles away from Laramie, which receives snow even in July. Prior to coming to Wyoming, I had spent most of my life in Punjab, Pakistan and was suddenly in the Rockies which were 10,000 feet high in altitude. Due to the high altitude, I developed a problem with recurrent nosebleeds. I went to an on-campus medical center and consulted with a physician about my nose bleeding. I found him very sympathetic, as he reassured me that with time the problem would go away.

My advisor in graduate school noticed that I was too shy to mingle with female students. I was paired with female classmates to work on my lab assignments. Within six months, I was able to overcome my shyness and was on the right track to achieve my goals. Besides the academic training, I would like to add that my Advisor also helped me in preparing myself for the working environment in the industry. During my graduate program, I lived at a walking distance from Engineering School. I used to go to school at 7:00 AM, come home for lunch, then go back to school and return home at 10:00 PM to sleep. Most of the time was spent in the library, my office within the department and my daily trip to post office on campus. Every weekend I used to go to buy groceries at 11:00 PM. It was about 10 minutes walking distance from my home. I used to walk to the grocery store, purchase my groceries and walk back around midnight. All the dogs in the neighborhood used to bark at me in the icy cold evenings.

I discovered that Americans love their pets, so much so that they are considered as family members. In our Eastern culture, we do not care about stray dogs

and cats. Like any other person from the Indian subcontinent, I was afraid of dogs. Once I was invited by my professor for dinner at his residence with other graduate students. I was well received by the lady of the house and was introduced to all the family members and pets. I did not show my 'expected respect' to the family dog. The wife of my professor picked up the dog, named "Ginger", and put the dog on my lap. It was a very difficult situation but one of my classmates helped in this situation. Later on I would visit the pet shop and play with puppies to overcome with my fear.

During the regular semester, we were too busy to meet our Pakistani, Indian, Iranian and Arabian friends. At the end of each semester we used to spend an evening together during which time we dined together, went to a nearby theater for movie and then came back and talked all night. We exchanged stories of our bad and good experiences, old days, love and betrayal stories, local adventures and our blunders due to cultural gap. Almighty God saved me throughout and I never violated my core moral values. My father, when saying me goodbye at Lahore Airport, had advise me to maintain my moral values and adopt the good values and traditions of American culture. I acted upon father's golden advice and it helped me a lot. America is not going to change for us, however, we have to make the best choices without violating any of their liberties. During my graduate school, I never dated any classmates, never touched wine or tasted pork. Even my Arabian friends used to complain to me that I was too conservative. During my stay in the graduate school, I took only one trip to Rochester, Minnesota for a job interview at IBM.

My elder brother Lutful Mannan and I moved to Laramie, Wyoming. He was accepted at the Physics Department while as mentioned earlier, I was admitted in the Electrical and Computer Engineering Department. I would like to acknowledge Dr. Mizan-ur-Rehman, a Graduate Student from Bangladesh, who was asked to review and evaluate my credentials. On his recommendations, my admission to Graduate School was approved. I was about a week late. This was a turning point in my life. I came to the US with $20.00. After two months, I was starting a graduate school without any discontinuity, with a full Teaching Assistant job. This was a miracle. All my prayers were accepted and all wishes and desires were fulfilled. My professors treated me very affectionately during my stay in the Graduate School, perhaps due to the fact that my father was also in the teaching profession. All my expenses for graduate studies, which totaled $36000 annually, were paid by the University of Wyoming. I would like to acknowledge my professors Dr. Ed Quincy, Dr. Steadman, Dr. R.G. Jacquot, Dr. F.M. Long, Dr. S.A, Husain and Dr. Constananides. I was able to complete my Graduate studies in eighteen months. I graduated in December 1980 and joined IBM at Rochester, MN, in the R & D Group (DASD Products) on the last working day of 1980.

This was a turning point in my life. I came to the US with $20.00. After two months, I was starting a graduate school without any discontinuity, with a full Teaching Assistant job. This was a miracle. All my prayers were accepted and all wishes and desires were fulfilled.

After gaining one year of experience at IBM Rochester, MN, I went back to Pakistan to visit my father who was about to undergo hip surgery. Upon my arrival, my father advised me to go and convey deepest sympathy to Hazrat Khalifa -tul-Masih III ABA on the loss of his wife. I was also advised to seek guidance from Hazoor about my future plans, whether to stay in Pakistan or return to the USA. I was inclined to settle down in Pakistan and take care of my parents in old age. My maternal uncle had arranged a job for me in WAPDA (Lahore) with the intention that I would stay and take care of my parents. I still remember my Mulaqat with Hazoor. I conveyed my father's personal message about Hazrat Begum Sahiba, and tears started rolling down his red cheeks. Hazoor was very composed and asked about my father's medical condition and proposed surgery. I informed Hazoor about the details of his surgery. Then I asked for Hazoor's guidance about my future plans. Hazoor advised me to return to the USA and settle there permanently. He reminded me that Jama'at had invested heavily in my moral and educational up-bringing. He recommended that I should become an asset for the Jama'at in the USA. After Mulaqat, I returned to Lahore and shared the details of the Mulaqat with my father who was totally confined to bed while waiting for

his surgery. Upon hearing Hazoor's advice about my future plans, my father advised me to send the telegram to my manager in IBM about resuming the job. After his successful surgery, his surgeon advised me to return to the U.S, as my father was expected to be discharged from hospital within a week. I returned to the USA and returned to my work when the telegraphic message about my father's demise was delivered on the phone in my office. I immediately informed my manager and the management decided to make the travel arrangements for me to attend my father's funeral in Rabwah. From the office, I went home, picked up my luggage and I was at the airport for a long, lonely, and sad journey home. By the time I arrived in Rabwah, my father was buried. I spent two weeks with my sister and mother in Lahore and returned to the USA.

I was very lucky to work closely with highly educated and talented scientists. Throughout my stay in IBM, both in Rochester, MN, and Austin, TX, I worked in the Research & Development Labs. This gave me opportunity to work closely with professors from Stanford University, with whom I had joint publications in IBM Journal of Research. I would like to acknowledge Dr. Hal Ottesen, Dr. Bob Ciskowski, Mike Stich, Dr. Byron Karuter, George Van Leewan and Rudy Hoffmann for their friendship, encouragement and support. During my stay in Rochester, I met Dr. A.J. Tajik, a well-known Pakistani Cardiologist at Mayo Clinic, and I still value his friendship to this day. Due to business reasons, I was transferred to IBM Austin, Texas, in November 1985 to the Special Technology Division. It was another pleasant experience to move from the harsh Minnesota weather to a good climate without any snow. I was selected to enhance my education in the areas of Electrical & Computer engineering at University of Texas Austin campus. I completed almost all course work under Dr. Womack. However, the business climate and personal problems did not allow me to pursue my dream and I was asked to return and focus on my full time job. I am thankful to Almighty God who provided all the opportunities and enabled me to be successful in pursing my personal and professional goals.

In October 1995 I suffered a heart attack. I worked until March 1997 with IBM Austin and took an early retirement from IBM. In April 1997 I joined Compaq Computer Corporation. This transition from IBM to Compaq turned out to be another blessing as I moved to Houston and started my new job as Signal Integrity Expert to ISS Division with better position, better pay and good working conditions.

I would like to re-emphasize that throughout my life, I have always consulted the Khalifa of the time regarding my personal and professional matters And I have always acted upon Khalifa's advice and I have faced all the challenges of life with grace and dignity. It is all due to the blessings and prayers of my spiritual leaders that I have come through very difficult circumstances and made it to the workforce in this country without any discontinuity.

I dedicate all of my achievements and accomplishments to my spiritual leaders, my late parents, teachers, professors, both in Pakistan and USA, who enabled me to stay focused and aim high and succeed and live with dignity and grace. Without their prayers, guidance and encouragement, it was almost impossible to come to the 'Promised Land' and contribute to the society. I hope and pray that my story will encourage new comers and young generation to aim high and become highly successful in in their areas of expertise and specialization. (Amen).

My Reminisces of Cricket in Rabwah

By Safir Rammah
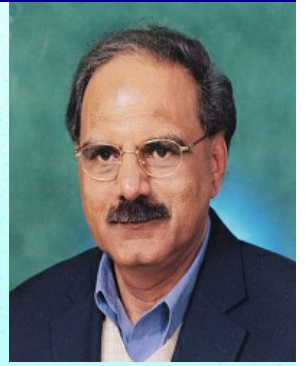
In my childhood in Rabwah, playing some sport with other kids of the Mohalla in the afternoon was a permanent part of our daily routine. There was no TV or Internet, and hardly any radios, to provide entertainment at home. Between Asar and Maghrib prayers, the only place to be was the Mohalla ground.

From the indigenous poor man's games like Meeroo Dabba, Gulli Danda and Kabadi, that didn't require the purchase of any special equipment, to modern games like Football, Field Hockey, Cricket, Volleyball and Basketball, all kinds of games were played at different levels in every part of the town, including some games that were unique to Rabwah. In my Mohalla, Dar-ur-Rehmat Sharqi, a game called Ring was played on a badminton type court and net with a solid rubber ring. Only recently I learned while surfing Internet that the real name of this game is Ringo. It was invented in Poland and is mainly played there. It is a mystery to me but Mohtaram Laeeq Ahmad Tahir sahib, now Missionary in UK, who was the champion player of Ring or Ringo in our Mohalla may know how it was introduced in Rabwah.

Hunting for birds was also a popular sport. A few people had air guns or shotguns, but mostly the weapon of Ghulail was used. Some Ghulail experts could do as much damage in an all day outing in nearby farms and villages as an expert sharp shooter of air gun. Birds of many varieties were in abundance in the surrounding areas. Muhammad 'Pahaŕia' (everyone who was somebody among the youth had a nick name), who was among the top Ghulail experts and lived in our Mohalla, would routinely bring home a bag full of pigeons and doves after a daylong hunting trip with his Ghulail.

I played all kinds of sports with my friends and schoolmates that were in vogue but cricket was my favorite game. I got the bug of cricket in primary school by watching my elder brother late Munir-ul-Haque Rammah and his friends play cricket and by later playing with them in the Mohalla team as a junior. Mohtaram Prof. Mubarak Abid and Dr. Naseer Ahmad Sheikh (Lahore) were among the prominent players in that team. From 6th grade on, that was the only game I was interested in playing by either joining one of the many teams that used to practice in various Mohallas or forming a club with friends and neighbors. The passion for cricket didn't dissipate but rather got stronger with time. During my high school days, I would find some excuse to skip school so that I could listen to the radio commentary whenever Pakistan's cricket team was playing a test match. My teachers would joke about it and say that I missed school because I was sick with 'criketaria'. While I was a student in T. I. College, I maintained a cricket club with the help of Sharif Ahmad (nephew of Prof. Sultan Mahmood Shahid sahib), Master Ibrahim and others that practiced daily in the Mandi ground adjacent to the Railway line. I think that I had played cricket in Rabwah more regularly and perhaps for the longest time than most others.

Cricket was introduced in Rabwah by players who had learnt to play it in Qadian. T. I. High School and College in Qadian had excellent cricket teams. Their

players must have received good coaching. I have seen some of them play cricket in Rabwah. Even though they were way past their prime, they displayed the correct technique that only comes with proper coaching. They were the pioneers of cricket in Rabwah. By mid to late 50's, cricket had made a strong foothold in Rabwah until it almost vanished by late 60's. Part of the reason for this was perhaps the fast changing landscape of Rabwah. During the early period, there were open grounds everywhere; most of which were residential plots that were not built yet. It was easier to find patches of hard surface and open grounds to play cricket and other games near one's home. Those temporary grounds started to disappear as the city was built and roads were surfaced, and with that most of the neighborhood sports activity came to an end.

I was a participant in the sport of cricket during the second half of this early period and have played some role in reviving cricket in Rabwah in the 70's. The following brief survey of the sport of cricket in Rabwah during my time there is based mostly on my recollections and I apologize up front if I forget to mention the name of any key player or important cricket event.

Late Mohtaram Muhammad Ibrahim Jamooni sahib, the Headmaster of T.I. High School and later a missionary in USA, was the true Guardian Angel of cricket in Rabwah. He himself was an excellent cricket player during his younger days in Qadian and had great love and passion for cricket. I remember that whenever Pakistan team was playing a test match, he used to keep a small blackboard outside his office to note and periodically update the score.

Late Mohtaram Muhammad Ibrahim Jamooni sahib, the Headmaster of T.I. High School and later a missionary in USA, was the true Guardian Angel of cricket in Rabwah. He himself was an excellent cricket player during his younger days in Qadian and had great love and passion for cricket. I remember that whenever Pakistan team was playing a test match, he used to keep a small blackboard outside his office to note and periodically update the score. Under his leadership and coaching, T.I. High school became a top notch training academy for budding cricketers in Rabwah. The school team remained one of the top teams in Jhang district and Sargodha board for several years.

The 1959 Jhang High School District Cricket Tournament was held in Rabwah at Jamia Ahmadiyya grounds. At that time, there was a vast open ground in front of Jamia's old building. The hostel of Jamia Ahmadiyya students, the adjacent road (now called College road) and many houses of Mohalla Dar ul Barakat were not built yet. I was still in primary school and eagerly watched a few matches. T. I. High School won the tournament and the feats of some of its players became the talk of town for a long period to come, and are still remembered. Mobashir Ahmad (s/o Hafiz Bashir-ud-Din Obaidullah sahib) scored a century and Saani delivered a hat-trick. This tournament was perhaps the biggest cricket event in Rabwah during the early period.

Mobashir Ahmad, College Cricket Team Captain, 1955-56

T. I. High school produced many fine players. Most of them went to T. I. College where they helped in building strong cricket teams. After they completed their college education, most of them left Rabwah and were never heard of as cricketers again. I am not sure if any one of them ever played first-class cricket. If they were provided the right path to continue to develop and demonstrate their skills, many of them could have made a name for themselves. Players like late Khawaja Abdus Salam who was a great stroke player and could produce a sixer on demand, Master Ibrahim who had magical skills as a spin bowler and many others were fully capable of playing at the highest level in Pakistan. The only Ahmadi cricket player that I know has played first-class cricket in Pakistan, and there may be others, is my cousin Maqsood Ahmad (s/o Choudhry Nazir Ahmad sahib) from Karachi. From Karachi University's

cricket team, he rose to be the captain of All Pakistan Combined Universities team and later joined the National Bank's team. He played 61 first-class matches from 1972/1973 to 1980/1981 at a decent average of 32.07.

The school and college players were also part of their Mohalla teams and clubs and that is where the daily action was. Most of the clubs were sort of seasonal but there were two prominent clubs during the early period that were well organized and were around for a relatively longer time: Fazal-e-Umar Cricket Club in Dar-ul-Sadar Janoobi and Latif Cricket Club in Dar-ul-Sadar Gharbi.

Fazal-e-Umar Cricket Club continued its practice from 1959 to 1966. It practiced in front of Mirza Mansoor Ahmad sahib's house on some empty residential plots. Later on, Nawab Mahmood Ahmad Khan (s/o of Nawab Muhammad Ahmad Khan sahib) built a cement pitch next to his house. This was the first cement pitch in Rabwah. Sahibzada Mirza Anwar Ahmad sahib, Sahibzada Mirza Azhar Ahmad sahib, Sahibzada Mirza Maghfoor Ahmad sahib, and Sahibzada Mirza Masroor Ahmad (now Khalifatul Masih V ABA) used to play in this team. Sahibzada Mirza Maghfoor Ahmad was the captain of the team until he went to attend the medical college. Saeed Ahmad became the captain after him. A Punjabinized variation of the word 'captain' became a permanent part of his name and even now all of his friends call him Kaptaan Saeed. My friend and class fellow Saeed Durrani also played in this team. The team had some good players. Mansoor Ahmad Bahri and Shaukat were excellent fast bowlers. Mubashar Khawaja, Ahya-ul-Din, Sahibzada Mirza Maghfoor Ahmad and Sahibzada Mirza Anwar Ahmad were the main batsmen. The team played a number of matches against Chiniot teams.

I once took my team to play a match against this team when I was in the 9th grade. It messed up my whole summer vacations. I was fielding at the silly point when a powerful stroke by Sahibzada Mirza Anwar Ahmad hit straight on my right knee. I somehow finished the match, which we lost, and walked home but then wasn't able to walk for the next two months even after getting daily massage of a tonic and loving care of my uncle Dr. Bashir Ahmad sahib.

Latif Cricket Club was formed in Dar-ul-Sadar Gharbi by the elder brothers of my class fellow Sahibzada Abdul Hayee (grandson of Hazrat Sahibzada Abdul Latif Shaheed) in 1958 and it continued to practice till 1964. There was a lot of talent in this team. Mirza Irshad Ali (now retired Brigadier and settled in USA) was an excellent bowler and his brother Saeed Ahmad Saadi, who later joined navy, was a good batsman. Sheikh Aftab was a stylish batsman. Saeedullah, who later became captain of T. I. High School's team, his elder brother Hameedullah, Sahibzada Jamil Latif and Sahibzada Faazel Latif were also part of the team. Latif Cricket Club played many matches with Lyallpur (now Faisalabad) teams, including with the club in which Aftab Gul, who later became a test player, used to play. Zulfiqar, a famous spinner of Lyallpur who later played first-class cricket, came to Rabwah a few times to practice with Latif Cricket Club and to teach their bowlers the art of spin bowling.

The only Ahmadi cricket player that I know has played first-class cricket in Pakistan, and there may be others, is my cousin Maqsood Ahmad (s/o Choudhry Nazir Ahmad sahib) from Karachi. From Karachi University's cricket team, he rose to be the captain of All Pakistan Combined Universities team and later joined the National Bank's team. He played 61 first-class matches from 1972/1973 to 1980/1981 at a decent average of 32.07.

Dar-ur–Rehmat Sharqi & Wasti and Mandi were the other centers of cricket. Some of the famous cricketers of the early period that I remember were: Hameedullah Pathan, Major Saeed Ahmad and his brother Sakhi Ahmed, who in my opinion was the best wicket keeper in Rabwah, Tazeem, Master Ibrahim, Sharif Ahmed, Rafiq Ahmad (Kardar) form Factory Area who was a master of Doosra, Mobashir Ahmad, Abdul Hai Baseer, Munirudin Shams, Bashirudin

Shams and Naeem-ur-Rehman Dard. Salah-ul-din was an outstanding fast bowler in my Mohalla team. Obaidullah who lived in the school boarding house and left Rabwah after school was a classy batsman. He was T. I. High School team's captain during 1962-1963. Saani was the most well known bowler during the early period. I had also heard some senior players talk about the bowling feats of Mobashir Ahmad who was captain of T. I. College cricket team in 1955-1956.

Two of the youngsters that I thought had great potential were Ansar Ahmed and Imtiyaz Rajayki. Imtiyaz Rajayki was a member of T. I. High School cricket team and is now settled in USA. Ansar Ahmed who joined army and had become a Major in Army Aviation died in a tragic airplane crash at Lahore Airport in 1979. Sardar Lateef was another good cricketer from Rabwah who died in an airplane crash in USA.

Late Sardar Latif Ahmad

Major Ansar, Shaheed

Two of the youngsters that I thought had great potential were Ansar Ahmed and Imtiyaz Rajayki. Imtiyaz Rajayki was a member of T. I. High School cricket team and is now settled in USA. Ansar Ahmed who joined army and had become a Major in Army Aviation died in a tragic airplane crash at Lahore Airport in 1979. Sardar Lateef was another good cricketer from Rabwah who died in an airplane crash in USA.

By 1960, the popularity of basketball had started attracting the best sporting talents in Rabwah. Many cricket players started playing basketball. Major Shahid Saadi sahib, a very talented athlete who used to play cricket during his school days, was equipped with the right physique and athletic abilities to become an excellent fast bowler. He, of course, chose the right path and became the captain of Pakistan's basketball team. Naeem-ul-Din (s/o Chaudhry Sulah-ul-Din sahib) had the mercurial athletic ability to become a terrific pinch hitter and fieldsman. He also adopted to play basketball and became an outstanding player like many other basketball players who had initially played cricket.

By mid 60's cricket slowly disappeared from Rabwah's sporting scene. Cricket was played at T.I. High School a little longer but was not played at T. I. College after 1965. By the time I returned back to Rabwah after finishing my post-graduate studies in Lahore in 1973, no one was playing cricket there anymore. As a matter of fact, there were no team sports in the whole city, except Basketball, Kabadi and a Field Hockey club run by Latif Ghaznavi. T. I. College and T. I. High School that had been providing the youth in the city with opportunities to engage in a variety of team sports were nationalized and their sports activities had greatly suffered.

On a personal note, Dr. Sultan Mahmood Shahid sahib, who enjoyed a lot of respect in the education department of Punjab's government, very kindly helped some of us who had completed our education to get a job at T. I. College as ad hoc lecturers under a new government scheme. Late Malik Tanvir Ahmad, Abdul Karim (Sweden), Abdul Hayee Basharat (Canada), Naeem Qadir (Canada) and I (USA) were in this batch of new hires. Except Malik Tanvir who stayed around and got the regular cadre and retired as a full professor, rest of us took this opportunity as a brief reprieve before leaving the country for various destinations within a few years.

After settling down in Rabwah, I gathered the youth of my Mohalla and started practicing cricket at the open ground in front of Maulvi Mohammad Siddique sahib's house. This open area which runs all the way to the end of Mohalla Dar-ur-Rehmat Wasti, with a road and primary school in between, has now been nicely developed into large grassy plots with fences
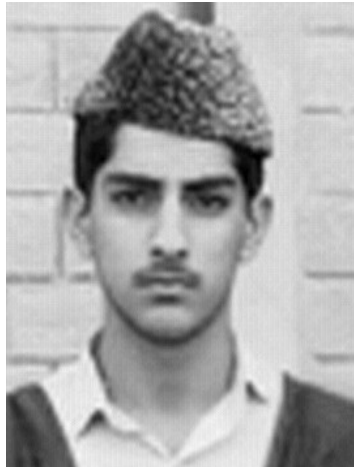
around them. We named our club as Fazal-e-Umar Cricket Club. After a few months of practice and coaching, the team was ready to play matches for which the only choice was to play with a club of some other city because we were the only cricket team in town.

The first time we invited a club from Sargodha, we had not yet prepared the wicket at Masjid-e-Aqsa grounds. After serving them tea and snacks at the college cafeteria, we took them to T.I. High School grounds to play the match. It was a weekday. The school was in session and some classes were being conducted outside under the sun as was the practice during the winter season. To our dismay, we found that a class was sitting right in the middle of the ground. When I approached them, I learned that it was the class of Master Naimat-ullah sahib, who himself was not with the class. On inquiring about where the teacher was, the students pointed towards the hill across the railway line and told me that one of the students had run away to avoid some punishment, and Naimat-ullah sahib was at that moment climbing the hill in hot pursuit.

I then went to the office of headmaster Abdus Sami sahib to request him to help us clear the grounds. Sami sahib refused to intervene in spite of my urgent pleas and advised me to wait for Naimat-ullah sahib to come back. We had no choice and both teams had to wait for almost an hour until Naimat-ullah sahib brought the runaway student back and made an example of him in front of his class. He then marched the class out of the ground so that we could start the match. In the afternoon, we ran into another problem. School ground was in those days being used by Latif Ghaznavi and his team for hockey practice. His team showed up around 4:00 PM for practice and now I had to plead with them to wait until our match was finished.

After this experience, we decided that we must have a suitable ground for practice and matches. There were two large open spaces available at the time, the open ground behind the basketball courts of T. I. College (now called the Ghor Doř ground) and the Masjid-e-Aqsa ground that was also used for Jamaat's annual gatherings. We settled for Masjid-e-Aqsa ground because it had a relatively even and hard surface. We laid a nice wicket in the middle of the ground by first digging out the earth for about 3 feet, laying down a layer of crushed stones and filling it with 'bhal' or sticky mud from the banks of river Chanab. Finally, I permanently 'borrowed' the heavy roller which was idly sitting behind the Biology section of T. I. College as a reminder of good old days when there was a college cricket team. The roller turned out to be very useful for us. Every week or two, we would soak the wicket by bringing water from Masjid-e-Aqsa and roll it hard and even. The wicket would easily last for a day long match or a couple of weeks of practice. It was a fast wicket which served us well since we had two good seamers: Abdul Hayee and my younger brother Baber (Aziz-ul-Haque Rammah).

Once we had a reasonably decent ground, we took the business of playing cricket very seriously. Players from other parts of the town joined the team and 20 to 22 players were regularly practicing in our team every afternoon. Special stress was placed on fielding practice, including using the large old college roller to practice for slip fielding by hitting the side of the roller with the ball to let the slip fielders practice catching it coming from different angles. The concrete stairs of the Mosque were used to practice the pull and hook shots as the ball would rise at a fast speed on the concrete surface. We obtained some good coaching books to learn the right batting and bowling techniques. The coaching book of Pakistan's test player Imtiaz Ahmad proved to be the most useful coaching guide for us. Players were required to maintain proper white cricket kit for matches. With the hard work and dedication of all players, Fazal-e-Umar Cricket Club became the best private cricket club in Rabwah's history till that time.

Within a year or so, most of the players developed excellent playing skills. Abdul Basit, Hayee's younger brother, turned out to be an all rounder in batting, bowling and fielding. Basit and Hameed continued to play cricket in Germany for many years after they migrated there. Baber was a genuine all rounder in the team who could swing the ball in the air while bowling and knew all the strokes in the book as a batsman. Nasim Ahmad (s/o Ali Mohammad B.A. B.T. sahib) was our wicket keeper who had to face Hayee and Baber's fast bowling. His elder brother Pervaiz Ahmad, who became an officer in the Air Force and later a Captain in PIA, also practiced with us off and on. Munir Ahmad (s/o Maulvi Mohammad Siddique sahib) was the other opening batsman with me. His younger brother Naseer Ahmad was also a member of the team. Hameed and Raja Abdur Rasheed were good slow spinners and very useful for breaking partnerships. My cousins Arif Ahmad, Tariq Ahmad and Khalid Munir

Ahmad were also part of the team. Two nephews of Maulvi Sharif sahib, Abdus Salam and Nasir Ahmed, who had played club cricket in Rawalpindi also joined the team and added to its strength. Master Naimatullah sahib, Nasir Rajpoot, Ikhlaq Ahmad, Malik Naseer Ahmad and many other players practiced with the team regulalrly. Bashir Sharif (son of Moulvi Sharif sahib) had demonstrated natural batting skills as a junior player and he latter blossomed into a superb batsman. Some other young players who later developed exceptional skills include Tayyab Ahmad Rathore, Naseer Ahmad Khawaja, Naseer Ahmad Gogi, Waheed Ahmad, Nasim Sindhi and Naeem Sindhi.

The first match that we played on our new wicket turned out to be quite sensational. We had invited a top -class team from Sargodha, Al Fatah Cricket Club, that included some players who were representing Sargodha Division in the Quaid-e-Azam Trophy and other first-class matches. Some officials of the Division's Cricket Board also accompanied the team. Sargodha team won the toss and elected to bat. Abdul Hayee and Baber opened the bowling attack. While Baber contained the runs with his accurate line and length, Hayee was in his true elements that day. In less than an hour, the whole team was dramatically packed for a very low score. Only one player was able to get in the double figure. Hayee took 9 wickets; five of them were clean bowled with super-fast and lethal yorkers. I could see from the first slip that every batsman who came to face our fast bowlers was surprised to discover their speed and accuracy. We easily won this match which was a great moral booster for the whole team and it also laid the grounds for Hayee's reputation as a fast bowler to reckon with.

Hayee was eventually selected in the Punjab Under-19 team. We started getting invitations to play matches from clubs in many cities and began a routine of inviting a club to play the match in Rabwah one week and go out next week to play in Chiniot, Jhang, Faisalabad,

Fazal-e-Umar Cricket Club, Rabwah, 1979

Standing: (right to left)1. Sakhi Ahmad, 2. Abdul Rab, 3. Azizul Haque Rammah, 4. Abdul Hayee, 5. Parviaiz Ahmad 6. Rana Abdul Shakoor, 7. Abdul Hameed Rammah, 8. Naseer Ahmad Khawaja, 9. Karimuddin Ahmad, 10. Mubarak Ahmad Goraya, 11. Fayyaz Ahmad

Sitting: (right to left)1. Tariq Shabbir, 2. Naseer Ahmad, 3. Abdul Salam Bhatti, 4. Bashir Ahmad Sharif, 5. Nasim Ahmad, 6. Nasir Ahmad, 7. Abdul Basit, 8. Munir Ahmad, 9. Naeem Bhatti, 10. Muzaffar Ahmad
(Photo: by Safir Rammah)

Sargodha, Lahore, Gujranwala, Rawalpindi, Islamabad, Wah Cantt and many other cities. We were regularly playing around 30 to 40 matches per year with clubs of other cities, winning most of the matches.

Losing a match was not something we took lightly. I remember one loss that was real hard to swallow, especially the way our fast bowlers who were the pride of our team were treated. It was the second match of our first week long tour of Lahore. After winning our first match against Muslim Gymkhana at Iqbal Parks, next day we faced P & T Gymkhana team on their grounds. They put us to field after wining the toss. Baber removed one of the openers in his first over and Ashraf Ali came to bat first down to join his brother Saadat Ali who was the other opener. Within a few overs, both of them started hitting all over the ground. More than individual talents of players of our team, it was the ability to quickly read the batsmen and adjust the bowling and field placing accordingly and the enthusiastic and focused efforts of everyone in the field that had worked miracles for us. It all failed on that occasion. This was our first experience with a wicket which was intentionally prepared to help the batsmen. We tried everything that we had learned so far but when Saadat Ali started getting out of the line of well-pitched deliveries and sending them cross-bat over the heads of second and third slip fielders, a couple of times for sixers to some unusual corners of the boundary, I knew that we were in deep trouble.

For about 20 overs we were rendered completely helpless while both the brothers executed all kinds of strokes freely and mercilessly until I realized that the only thing that will work on this pitch against the phenomenal talents of these two brothers are dead slow balls. I should have listened to my younger brother Hameed a few overs earlier who had correctly judged that we should try to use slow spin even before the ball had lost it shine. Eventually I handed the ball to Hameed and other slow spinners. Saadat Ali was soon caught near the long-on boundary line trying to hit another sixer. He missed his century by a few runs. Ashraf Ali also left soon after, but not before completing his hundred which was the first century scored against us thus far. We took care of the rest of the batting line rather quickly.

On our turn, Nasir and I briefly repeated the same feat by scoring 104 runs in the first 10 overs. Nazir Ahmad, a slow off-spinner of Railway team, then came on and we were all out for about 140 runs. This was a defeat as thorough as can be and was also dully reported in the sports section of Pakistan Times. It bothered me for a long time, especially our inability to stem the onslaught of runs by Saadat Ali and Ashraf Ali. We learned many lessons from this experience and never again let any batsman totally dominate our bowling attack.

Hayee was eventually selected in the Punjab Under-19 team. We started getting invitations to play matches from clubs in many cities and began a routine of inviting a club to play the match in Rabwah one week and go out next week to play in Chiniot, Jhang, Faisalabad, Sargodha, Lahore, Gujranwala, Rawalpindi, Islamabad, Wah Cantt and many other cities. We were regularly playing around 30 to 40 matches per year with clubs of other cities, winning most of the matches.

We did win some matches against P & T Gymkhana team on our subsequent tours of Lahore. I had by then left the country. When I first learned that our team has defeated them on their grounds and Basit and Baber had done some real damage with their bats, the burden of the earlier defeat was finally lifted from my chest. Saadat Ali and Ashraf Ali were both later selected for Pakistan's team. Ashraf Ali played 8 test matches in the eighties as a wicketkeeper batsman in the absence of Wasim Bari, at a high average of 44.79. He was sidelined when Wasim Bari returned back to the team. Saadat Ali represented Pakistan in one-day Internationals and has the unique honor of becoming the first Pakistani batsman to carry his bat (79 not out) in a one-day international match against England. He also maintained a remarkable average of 47.97 in 168 first-class matches.

Fazal-e-Umar Cricket Club continued to practice

and tour various cities of Punjab to play matches after I went abroad. Moulvi Khursheed Ahmad sahib started regularly providing some funds to the team which was a great help. The wicket that we had prepared and maintained with so much effort finally started crumbling and the team decided to dig it again and resurface it. This time they were reported to Amoor-e-Aama's office and were summoned by Mirza Mansoor Ahmad sahib who informed them that they cannot be allowed to dig the ground of Jalsa Gah. He also very kindly asked them to propose an alternative. When he was told that the only alternative is to buy matting, he very generously offered to buy matting for the team. That is how the first matting wicket was laid in Rabwah.

The cricket scene in Rabwah changed dramatically after Hazrat Mirza Tahir Ahmad sahib became the Khalifatul Masih IV^th^. Hazur asked Mohtaram Ibrahim Jamooni sahib to form an All Rabwah Cricket team. He in turn appointed my younger brother Hameed Rammah who was then the captain of Fazal-e-Umar Cricket Club to convert it into an All Rabwah Cricket Club by selecting players from all other teams. Once the team was formed, the players were invited for a mulaqat with Hazur. This new team continued to practice at the Masjid-e-Aqsa grounds and was generously financed by the Jamaat. The game of cricket was now fully established in Rabwah and has progressed since then. It is also the favorite game of Jamaat's youth in many countries and an International Masroor Cricket Tournament is played in UK every year in which teams from many countries around the world come to participate.

I am not an eye witness to the recent conditions of cricket playing in Rabwah although I do try to stay informed, but I have seen an astonishing glimpse of the future of cricket in Rabwah. During one of my usual once in a couple of year's winter trips to Pakistan a few years ago, I was told that a new ground for cricket was built in Rabwah. It is part of the tract of land that has been bought by the Jamaat for a future Jalsa Gah. A paved road leads to the cricket ground. When I got out of the car and turned around to look at the cricket ground, for a moment I thought that I had arrived at the heaven for cricketers. In front of me was a beautiful, full sized, level and grassy ground with a nicely laid out true turf wicket in the middle of it. There were 3 practicing nets on one side and a built structure consisting of two or three rooms in a corner of the ground. A warning to be prepared for a pleasant shock should be given before showing this ground to someone like me who has spent his younger years playing cricket on various dusty patches in Rabwah. I was later told that the same grounds man and curator of Pakistan Cricket Board who prepares the test wickets had prepared the turf wicket of Rabwah's cricket ground. My hats off to all who were part of building this ground.

Hayee is running an all Rabwah Cricket Club that practices on this ground. My advice to him or anyone who manages this team is that now that we have the proper infrastructure for practicing and playing cricket in Rabwah, they should chalk out a path to glory for Rabwah's cricketers. Hayee knows very well how important it was to develop a close relationship with Sargodha Division's cricket authorities and to build his reputation all over Punjab for his selection in the Punjab Under-19 team. There should be some planning and guidance for the players to join the college and university teams, and later the teams of various institutions where they are employed after education. Talented players should be sent to cricket academies that are run by retired test players in Karachi, Lahore and Rawalpindi to groom them. I look forward to when a cricketer from Rabwah will wear the green colors of Pakistan's cricket team. That will be the day!

I am not there yet, and still have a few moves left in me, but I am sure that if I will live long enough and get to a point where there is not much to look forward to and nostalgia of days gone by is among the few pleasures left, I will look back to those few hot summers that were spent with Fazal-e-Umar Cricket Club, Rabwah, and will think: what a ride it was! I will, of course, always remain thankful to my teammates with whom I had shared those fleeting moments of pure and undiluted and unburdened joy in the innocence of our youth.
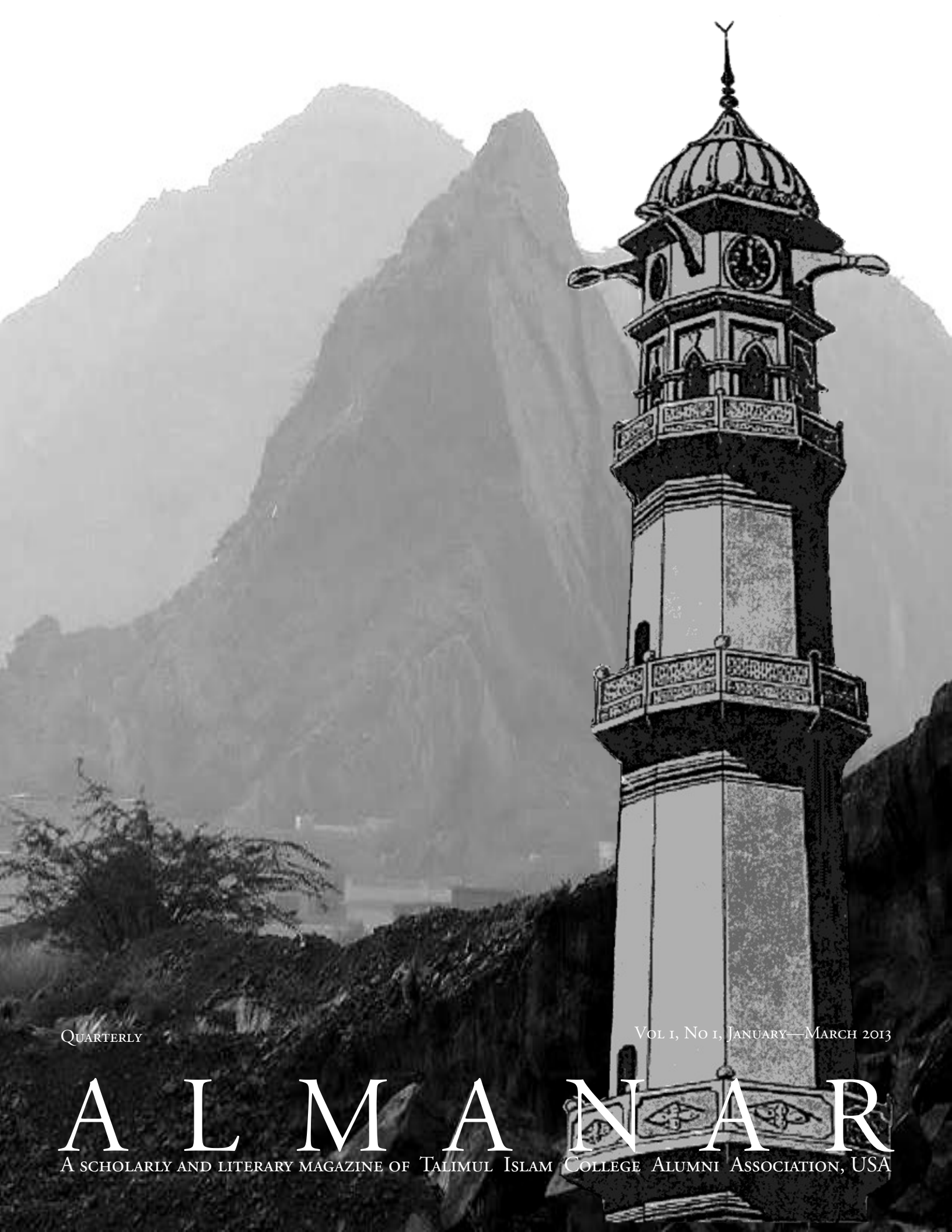
Quarterly
Vol 1, No 1, January—March 2013
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA